فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	اللہ سے مغفرت مانگنا	ڈاکٹر میمونہ حمزہ	8
قولِ نبیؐ	رسولؐ اللہ کی نماز	ڈاکٹر محمد عبدالحئی	14
خاص مضمون	حجاب کا رجحان اور پاکستانی عورت	صائمہ اسما	20
نوائے شوق	نعت	عشرت گورداسپوری	26
	غزل	حبیب الرحمٰن	27
	غزل	آمنہ رمیصا زاہدی	27
	مرے گھر کو بنا دو گھر دوبارہ	عشرت زاہد	28
حقیقت و افسانہ	مضطرب روح کو ایک گھر مل گیا	میمونہ حمزہ	29
	بند مٹھی میں ریت	قانتہ رابعہ	34
	سرپرائز	فرحی نعیم	37
	میری اماں	فریدہ عظیم	42
	انعام	شہلا خضر	45
مشاہدات	سعودی عرب میں رہنے کا تجربہ	ڈاکٹر فائقہ اویس	48
ہلکا پھلکا	بے بسی	ذروہ احسن	55
	ناول نگاری کی آرزو	عبید حارث	57
سیر و سیاحت	سیر و سفر ساتھ ساتھ	قانتہ رابعہ	59
خدمت خلق	کرو مہربانی تم اہل زمیں پر	ڈاکٹر ثمین ذکا	60
محشر خیال	پروفیسر خواجہ مسعود		66
گوشۂ تسنیم	شریک زندگی کا انتخاب (۲)	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	68
منتخب کالم	سچ تو یہ ہے	انصار عباسی	70

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام!

اللہ کا شکر ہے کہ زندگی رفتہ رفتہ معمول پر آ رہی ہے۔ احتیاطی تدابیر کے ساتھ سکول اور دفاتر کھل گئے ہیں، تقریبات بھی منعقد ہونے لگی ہیں۔ اگرچہ محتاط رہنے کی اب بھی ضرورت ہے کیونکہ بیماری کے اعداد و شمار موجودہ سطح سے نیچے نہیں آ رہے۔ لاپروائی ہوئی تو اس سطح سے دوبارہ کیسز بڑھ سکتے ہیں۔ ہمارے سامنے کئی ملکوں میں وبا کا پھیلاؤ دوسرے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ اس بیماری نے دنیا بھر میں اَن گنت گھروں میں صفِ ماتم بچھائی ہے۔ کئی پیاروں کو جدا کیا ہے، کئی گھروں کے واحد کفیل چلے گئے اور زندگی بھر کا روگ دے گئے۔ بہت سے مسیحا، خدمت خلق کے رضا کار موت کے منہ میں چلے گئے۔ ایک بلا تھی کہ آسیب جس نے بلا تفریق ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اور اب بھی بہت سے خطوں میں یہ بلا جان چھوڑتی نظر نہیں آتی۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ بین الاقوامی نقل و حرکت اور سیاحت کو ایک بار پھر جاری و ساری ہونے میں ابھی خاصا عرصہ اور لگے گا۔ اور کچھ عادتیں تو شاید مستقل ہی اپنانی ہوں گی مثلاً ہجوم میں ماسک پہننا، بار بار ہاتھ دھونا، آنکھوں کو نہ چھونا وغیرہ۔ بہر حال وبا کی اس عالمگیر آزمائش نے انسان کو بہت کچھ سکھایا ہے، انسان کو اس کی حقیقت یاد دلائی ہے، اپنے خالق کی طرف متوجہ کیا ہے، انسانوں میں پیدا کی گئی مصنوعی تفریق کو مٹا کر رکھ دیا ہے۔ جہاں روزگار پر بہت زد پڑی ہے، وہیں روزگار کے نئے طریقے بھی ایجاد ہوئے ہیں، ہم نے ہر حال میں اپنے کام اور مصروفیات کو جاری رکھنا سیکھا ہے اور بہت سی چیزوں کے متبادل ڈھونڈے ہیں۔ سب سے بڑھ کر نئی ابلاغی ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانا سیکھا ہے۔ ٹیکنالوجی کو اپنانے کے لحاظ سے پاکستانی بہت ڈھیلے ہیں۔ ہمارے روایتی تعلیمی اور دفتری ڈھانچے میں بہت کچھ فرسودہ چلا آ رہا ہے جس کو ایک عرصے سے تبدیل ہونے کی ضرورت تھی۔ امید ہے کہ لاک ڈاؤن کے حالات نے کئی جگہوں پر بہتری کا امکان پیدا کیا ہوگا۔ گھروں سے کام کی کامیابی نے بھی نئے امکانات کا دروازہ کھول دیا ہے۔ بہت سے ایسے کام ہیں جو آمد و رفت کا وقت لگانے، سڑکوں پر ٹریفک کا رش بڑھانے اور دفتری وسائل استعمال کرنے کے بغیر بھی بخوبی انجام پا سکتے ہیں۔ خصوصاً خواتین کے لیے ان امکانات سے فائدہ اٹھانے کے راستے کھولے جانے چاہئیں تاکہ ان کے لیے گھروں کو چھوڑے بغیر اپنے فرائض کی انجام دہی ممکن رہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا اور جانا کہ نکاح کس قدر آسان فریضہ ہے جسے ہم نے تقریبات کے ہجوم سے منسلک کر کے مشکل بنا دیا ہے۔ یہ ایسا فریضہ ہے جو غیر معمولی حالات میں بھی خوش اسلوبی سے انجام پا سکتا ہے۔ اس کی سادگی کو مجروح کرنے والے عوامل ہمارے اپنے ہی ذہنوں کی اختراع ہیں۔ وہ سب عوامل وبا کی صورتحال میں بے اثر ہو گئے تو اس کی اصل خوبصورتی نکھر کر سامنے آ گئی۔

ایف اے ٹی ایف کی شرائط پوری کرنے کے لیے ہم بہت کچھ اپنے مفادات کے خلاف کرنے پر مجبور ہیں۔ اب پارلیمان سے جو تازہ بل منظور کروایا گیا اس میں بنیادی شہری آزادیوں کو سلب کیا گیا ہے۔ یہ منی لانڈرنگ اور دہشت گردی پر کنٹرول کے ساتھ ساتھ وفاق میں اوقاف کنٹرول پالیسی پر مشتمل ہے۔ جبکہ اس تیسرے نکتے کو خفیہ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے منی لانڈرنگ بل کہا گیا۔ تیسرے نکتے کی شقیں حیران کن ہیں۔ مسجد و مدرسہ کو فنڈ دینے پر ایک شخص کو اپنی مکمل ''منی ٹریل'' دینا ہوگی جس کی تفصیلات انتہائی پیچیدہ اور مشکل ہیں اور اگر مکمل ریکارڈ میں کوئی ایک بھی تفصیل فراہم نہ کی جا سکی، جو کہ پاکستان کے نظام میں عین ممکن ہے، تو مسجد حکومت کے قبضے میں چلی جائے گی۔ نیز ایسے شخص کو اس نیکی کی پاداش میں بغیر وارنٹ ''اٹھا'' لیا جائے گا، نہ ضمانت ہو سکے گی نہ عدالت کی مداخلت، اور وہ چھ ماہ کے لیے غائب تصور ہوگا۔ اسی طرح کسی بھی ''حکومت مخالف'' بات پر خطیب کو اٹھا لیا جائے گا اور وہ گمشدہ ہو جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ جب بار بار کی چھان بین سے بھی مساجد اور مدارس کا دہشت گردی سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوا تو پھر اس بل کا اصل مقصد کیا ہے؟ حکومت کے بجٹ میں کہیں بھی مساجد اور مدارس بنانا شامل نہیں ہوتا۔ یہ تو عوام ہیں جو دین کی محبت میں اور دینی تعلیم عام کرنے کے لیے ایسے کام دینی جذبے سے کرتے ہیں، عوام ہی انہیں بناتے اور چلاتے ہیں۔ مگر اب نیکی کا یہ کام اس قدر مشکل بنا دیا گیا ہے کہ ہر کوئی مسجد مدرسہ بناتے ہوئے یا ان کو فنڈ دیتے ہوئے دس بار سوچے گا۔ ہمارے ہاں نیکی کے ایسے کام ریاکاری سے بچنے کے لیے اکثر نام بتائے بغیر کیے جاتے ہیں، جبکہ اس قانون کی موجودگی میں یہ بھی ممکن نہیں رہا۔ ایسی قانون سازی آئین پاکستان اور ہمارے دینی تشخص سے تو متصادم ہے ہی، بنیادی انسانی حقوق کے بھی خلاف ہے۔

لاہور کے قریب موٹروے پر پیش آنے والا دلخراش واقعہ ملک بھر میں اضطراب اور پریشانی کا باعث بنا۔اس واقعے کے کئی پہلو ہیں۔ایک پہلو عورت کا اکیلے نکلنا ہے۔معاشرے کو دو عوامل مل کر درست رکھتے ہیں۔ایک اخلاقی اصول اور دوسرا قانون کا ڈنڈا۔ ہمارا دین دونوں پر زور دیتا ہے۔ ایک مشہور حدیث کے مطابق معاشرہ تب محفوظ سمجھا جاتا ہے جب وہ ایک اکیلی عورت کے لیے محفوظ ثابت ہو۔اور یہ نوبت تب آتی ہے جب دونوں عوامل اپنا بھرپور کام کر رہے ہوں۔ہم مسلمان ضرور ہیں مگر اسلامی اخلاقیات ہمارے مجموعی نظام کا حصہ نہیں بن سکی۔اور قانون کا تو یہ حال ہے کہ اصل مجرم ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا۔مقدمات سالہا سال لٹکتے رہتے ہیں اور پھر طاقتور مجرم کے حق میں فیصلہ آجاتا ہے۔فوری انصاف تو دور کی بات، انصاف ہی کا حصول ہنوز ایک خواب ہے۔ایسے میں اگر یہ معاشرہ چل رہا ہے تو رہی سہی اخلاقیات ہی کی بنیاد پر چل رہا ہے۔

دوسرا پہلو اس جرم کی سزا سے متعلق ہے۔اسلام میں شادی شدہ مجرم سنگساری کا مستحق ہے جو ایک تکلیف دہ اور سرعام سزائے موت کی عبرت انگیز شکل ہے۔ اس سے جرم کے پھیلاؤ کو جرم ہونے سے پہلے روکنے میں مدد ملتی ہے۔اس واقعے کے بعد ملک گیر مطالبہ ہؤا کہ مجرم کو اسلامی سزا یا پھانسی دی جائے۔ ایسے میں وہ طبقہ سامنے آیا جو مسلمان ہونے پر مغرب کے آگے شرمندہ رہتا ہے۔اس طبقے کی زبان پر مجرموں پر نفرین بھیجنے کے ساتھ ساتھ مجرموں کے لیے ہمدردی بھی تھی کہ ان کو سزائے موت نہ دی جائے۔یہ منافقانہ موقف بالکل ناقابل فہم ہے۔ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ اسی سال کے آغاز میں پارلیمان میں پیش کردہ زینب الرٹ بل کے ضمن میں جماعت اسلامی کے سوا سب جماعتوں نے بچیوں کے ساتھ درندگی کے مجرموں کے لیے سزائے موت کی مخالفت کی تھی۔موٹروے کیس میں بھی ان جماعتوں کے نمائندے میڈیا پر آکر ڈھٹائی سے اسی موقف کو دہراتے رہے۔مظلوم کی بجائے مجرم سے ہمدردی کا یہ رویہ افسوس ناک ہے۔حالیہ واقعے پر عوامی رائے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ لوگ اپنے ووٹر کی رائے کی ہرگز نمائندگی نہیں کرتے،اس لحاظ سے یہ حق نمائندگی کھو چکے ہیں۔

تیسرا پہلو میڈیا کے رویے کا ہے۔میڈیا کو ایک اشو ہاتھ آجائے تو ہر کوئی ریٹنگ بڑھانے کے چکر میں بڑھ چڑھ کر اپنا حصہ ڈالتا ہے۔اس کے نتیجے میں جرم کی وہ تشہیر اور فحش کی وہ اشاعت ہوتی ہے جو برائی کو اور زیادہ پھیلانے کا سبب بنتی ہے۔قرآن اسی لیے فحش کی اشاعت کو سختی کے ساتھ منع کرتا ہے۔اس واقعے کے تناظر میں پاکستانی معاشرے کی منفی تصویر ابھارنے والوں کو بھی خوب موقع ملا۔فرانس کی مثال دینے والے یہ تو دیکھیں کہ یورپی ممالک اور امریکہ میں قانون کتنا طاقتور اور انصاف کا کتنا بول بالا ہے،مگر جن علاقوں میں قانون کا زور نہیں چلتا وہاں رات کو تو کیا دن کو بھی،عورت تو کیا مرد بھی اکیلا نہیں جا سکتا،سیکیورٹی اداروں کی جانب سے باقاعدہ ہدایات جاری کی جاتی ہیں۔اور جہاں قانون چلتا ہے وہاں بھی کرائم انڈکس خوفناک ہے۔گزشتہ سال نومبر میں نیویارک جیسے بڑے شہر کے مرکزی اور انتہائی بارونق علاقے میں رات کے وقت سڑک سے گزرنے والی ایک لڑکی کا قتل ہؤا جبکہ وہاں یہ ایک معمول کا جرم تھا۔میڈیا کا کام مسائل کے درست حل کی طرف عوام اور حکومت کی رہنمائی کرنا ہے،محض بار بار تذکرہ کر کے مزا لینا نہیں یا معاشرے کو برا کہہ کر منفی سوچ پھیلانا نہیں۔نیوز چینلز کو احساس ہونا چاہیے کہ لوگ خبریں جاننے کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں مگر ان کو اینگزائٹی کا مریض نہ بنایا جائے،نہ ہی بلاوجہ خود ملامتی کو فروغ دیا جائے۔اس واقعے نے جہاں سب سٹیک ہولڈرز کو اپنا اپنا موقف دینے کا موقع دیا وہاں عورت مارچ کا قبیح ایجنڈا رکھنے والی عورتوں نے بھی معاشرے اور مردوں کے خلاف زہر اگلا۔حالانکہ اگر کسی عورت یا بچی کے ساتھ ظلم ہو تو اس کے قریبی مرد رشتہ دار اس مظلوم سے اگر زیادہ نہیں تو کم اذیت میں بھی نہیں ہوتے۔یہ عورت بمقابلہ مرد کا مسئلہ نہیں ہے،خیر بمقابلہ شر اور قانون بمقابلہ لاقانونیت کا مسئلہ ہے۔

چوتھا پہلو یہ ہے کہ جرم ہونے سے پہلے جرم کو روکنے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ان میں سرفہرست انٹرنیٹ کے ذریعے فحش کے پھیلاؤ پر پابندی لگانا ہے۔اس لعنت نے ہمارے معاشرے کو گندگی کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔اس کے بعد میڈیا اور تعلیمی اداروں کو عوام کی اخلاقی تربیت کے لیے استعمال کرنا،رزقِ حلال کا شعور دینا ہے۔ایسے جرائم کے سدباب کے لیے کئی سطحوں پر کئی نوعیت کے اقدامات کی ضرورت ہے۔اللہ کرے تبدیلی کا نعرہ لگانے والے اس ضمن میں کچھ کر سکیں۔

لکھنے والوں کی نگارشات پر آپ کی وقیع آرا کا انتظار رہے گا۔اگلے ماہ تک اجازت بشرطِ زندگی

صائمہ اسما

ڈاکٹر میمونہ حمزہ

استغفار

اللہ سے مغفرت مانگنا

استغفار شیطان اور اس کی فوج کے خلاف مومن کا ہتھیار ہے۔اپنی غلطی پر ندامت کے ساتھ استغفار ہمارے باپ آدم علیہ السلام کی سنت ہے اور اپنے عمل پر ضد اور اصرار کے ساتھ جم جانا ابلیس اور اس کے ساتھیوں کا طریقہ ہے۔ ہر زمانے میں انبیاءؑ وصالحین اور متقین نے اپنے باپ آدمؑ کی سنت کو اختیار کیا ہے، جبکہ اللہ کے باغی اور نافرمانوں نے شیطان کے طریقے کو اپنایا ہے۔

استغفار ایک بڑی عبادت ہے جس کا شرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو عطا کیا ہے۔اللہ تعالیٰ کے نبی مکرم حضرت محمد ﷺ نے خود اپنے اوپر استغفار کو لازم کر رکھا تھا تو پھر دیگر مسلمانوں کا کیا حال ہوگا۔استغفار کرنے والوں کو اللہ کی محبت ملتی ہے، اور اللہ مغفرت مانگنے والوں اور استغفار کرنے والوں پر بڑا ہی کرم فرمانے والا ہے۔

استغفار کے معنی مغفرت کی طلب کے ہیں، اور مغفرت کے معنی گناہوں کی پردہ پوشی اور ان کے شر سے بچاؤ ہے۔ بندہ اللہ سے استغفار کرتا ہے کہ اللہ دنیا میں اس کے گناہ پر پردہ ڈال دے، اور اس کا گناہ اس کی فضیحت کا سبب نہ بنے اور آخرت میں بھی اس کو ظاہر نہ کرے اور اپنی رحمت اور عفو سے اس کا گناہ معاف فرمادے۔

استغفار کی فضیلت یہ ہے کہ قرآن کریم میں استغفار کرنے کی ترغیب کثرت سے دی گئی ہے، ایک مقام پر فرمایا:

''اللہ سے استغفار کرتے رہو، بے شک اللہ بڑا غفور ورحیم ہے''۔(المزمل،۲۰)

اللہ تعالیٰ استغفار کرنے والوں کی مدح بیان کرتا ہے:

''رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں''۔(آل عمران،۱۷)

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ رات کی آخری گھڑیاں یعنی تہجد کا وقت استغفار کا بہترین وقت ہے۔حضرت یعقوبؑ کو ان کے بیٹوں نے جب معافی کی درخواست کرنے کو کہا تو انہوں نے سحر کے وقت کا انتظار کیا اور سحر میں اللہ سے ان کے لیے معافی کی درخواست کی۔(تفسیر ابن کثیر، ج۱،ص۴۳۴)

اور اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ جو لوگ اس کے حضور استغفار کرتے ہیں ہیں وہ ان سے کیا معاملہ کرتا ہے:

''اگر کوئی شخص برا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے درگزر کی درخواست کرے، تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا''۔(النساء،۱۱۰)

اس آیت میں وہ کلیہ بیان کیا گیا ہے جس کے مطابق اللہ اپنے بندوں کے ساتھ سلوک و انصاف کرے گا۔ اس آیت میں معافی کا دروازہ چوپٹ کھلا رکھا گیا ہے۔اگر لوگ توبہ کریں تو اللہ کے دروازے کو کھلا پائیں گے۔ اس طرح ہر گناہگار تائب کو معافی کی امید دلائی گئی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ موجود ہے، اور اس کی رحمت اور مغفرت موجود ہے بشرطیکہ کوئی معافی مانگنے والا اور استغفار کرنے والا موجود ہو۔ بندہ کسی غیر پر ظلم کرے یا خود اپنے نفس پر، بہر حال ظالموں کے لیے معافی کا دروازہ کھلا ہے، اگر وہ استغفار کرلیں۔ اور اگر وہ توبہ کر کے واپس آئیں تو وہ انہیں معاف کرنے کے ساتھ ان پر رحمت بھی کرتا ہے۔ باب المغفرت کھلا ہے اور اس پر کوئی دربان نہیں، اور یہ اعلان، اعلانِ عام ہے۔ بے قید اور بے شرط ہے۔ جب بھی وہ توبہ کر کے لوٹ آئیں تو اللہ غفور ورحیم ہے۔ (فی ظلال القرآن، تفسیر نفس الآیۃ)

استغفار بندے اور رب کو ملانے والی صفت ہے، اور یہ رب تک رسائی کا کھلا دروازہ ہے۔اعترافِ جرم، ندامت اور استغفار، اپنی کمزوری کا شعور اور اللہ سے استعانت اور رحمت طلب کرنا، اور یہ شعور کہ اللہ کے

سوا کوئی قوت کا سرچشمہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی معاونت کرسکتا ہے۔

استغفار ایک دائمی عبادت ہے، اور یہ گناہگاروں کا سہارا اور عبادت گزاروں کا طریقہ ہے۔ مالک الملک کے حضور توبہ کا اس سے بہتر طریقہ کیا ہوگا کہ بندہ اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور اپنے قصوروں اور کوتاہیوں کی مغفرت طلب کرلے۔ استغفار محض چند کلمات نہیں بلکہ یہ عاجز بندے کا غفور ورحیم رب سے گہرے تعلق کا راز ہے۔ جو بندے اللہ سے استغفار کرنے کا تعلق استوار کرتے ہیں وہ انہیں اپنے مامون بندوں میں شمار کرتا ہے اور انہیں مقہور اور عذاب کا شکار ہونے والے گروہوں میں شامل نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا نہ تھا جبکہ تو ان کے درمیان موجود تھا اور نہ اللہ کا یہ قاعدہ ہے کہ لوگ استغفار کررہے ہوں اور وہ ان کو عذاب دے دے''۔ (الانفال، ۳۳)

یعنی کسی گناہگار بستی میں نبی کا موجود ہونا اس بات کا امکان بھی ہے کہ بستی کے لوگ ایمان لے آئیں، اور اللہ کا قاعدہ یہ بھی ہے کہ لوگ استغفار کررہے ہوں تو وہ ان پر عذاب نازل نہیں فرماتا، اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو عذابِ الٰہی کے مستحق ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ حج بیت اللہ جیسی بڑی عبادت کی ادائیگی کے موقع پر بھی استغفار کی تاکید فرماتا ہے:

''پھر جہاں سے لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو، یقیناً وہ معاف فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے''۔ (البقرۃ، ۱۹۹)

یعنی اعمال کی قبولیت کے مقام اور اس کی رحمتوں کے نزول کے مقام پر بھی استغفار کی تاکید ہے کہ محض زبان سے کلمات ادا نہ ہوں بلکہ دل سے توبہ بھی کی جائے۔ اگر زبان دل کی شمولیت کے بغیر استغفار کرتی رہے تو وہ غیر نافع ہے۔

استغفار کرنا اہلِ ایمان کی پسندیدہ صفت ہے، ارشاد ہے:

''جن کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی فحش کام ان سے سرزد ہوجاتا ہے، یا کسی گناہ کا ارتکاب کرکے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آجاتا ہے اور وہ اس سے اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کرسکتا ہو۔ اور وہ دیدہ ودانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے''۔ (آل عمران، ۱۳۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت کس قدر کشادہ دل ہے، اور اللہ اپنے بندوں کے معاملات میں کس قدر فیاض ہے۔ یہ دینِ اسلام کی فیاضی ہے کہ وہ گناہ کا ارتکاب کرنے والوں اور اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کو بھی متقین میں شمار کرتا ہے۔ گناہ اور فحش کام اسلامی نقطہ نگاہ سے بدترین گناہ اور بڑے گناہوں میں سے ہیں، اور یہ اس دین کی فیاضی ہے کہ وہ فاحشی جیسے گھناؤنے جرم کے ارتکاب کرنے والے کو بھی راندہء درگاہ نہیں بناتا، اور اس پر رحمت کے دروازے بند نہیں کئے جاتے۔ نہ یہ دین ایسے لوگوں کو دوسرے درجے کے مسلمان قرار دیتا ہے، بلکہ ان کو بھی متقین کے اعلیٰ درجے پر فائز کرتا ہے، اور اس درجے پر پہنچنے کے لیے ان پر صرف ایک شرط عائد کی جاتی ہے، وہ شرط یہ ہے کہ ارتکابِ معصیت کے بعد معاً وہ اللہ کو یاد کرلیں، اور اپنے گناہوں پر استغفار کرلیں اور پھر اس گناہ پر اصرار نہ کریں، اور یہ کہ وہ معصیت میں بے شرمی اور بے باکی سے غرق نہ ہوجائیں اور اللہ کی بندگی کے دائرے میں رہیں اور اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں۔ بندہ جب تک اللہ کو یاد رکھتا ہے اور اس کے دل میں اس کا خوف پایا جاتا ہے، جب تک وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے، اس کی بندگی کا اقرار کرتا ہے اور اس کی نافرمانی اکڑ کر نہیں کرتا تو وہ راہِ راست پر آسکتا ہے۔ اس طرح توبہ کا دروازہ کھلا رکھ کر اسلام بے راہ روی میں لوگوں کو آزاد نہیں چھوڑتا، اور وہ گناہ کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا، بلکہ گناہ پر ندامت اختیار کرنے والوں اور استغفار کرنے والوں کی ہمت بندھاتا ہے۔ (دیکھئے: فی ظلال القرآن، تفسیر نفس الآیۃ)

اکثر اوقات توبہ اور استغفار کا ذکر اکٹھے کیا جاتا ہے، استغفار اس کیفیت کا نام ہے جب بندہ اللہ کے سامنے اپنے گناہوں کی مغفرت زبان سے مانگتا ہے، اور توبہ اس کے دل اور اعضاء سے اس گناہ کا اثر ختم کردینے کا نام ہے، توبہ میں ایسی ندامت پائی جاتی ہے کہ بندہ اس گناہ کا دوبارہ ارتکاب کرنے کا خیال بھی نہ لائے اور اسے اپنے اعمال کے دفتر

سے بھی مٹا دینا چاہے۔ استغفار کا حکم دعا کا ہے، جسے اللہ رب العالمین قبول یا رد کر دیتا ہے۔ اور جب دعا منکسر المزاجی سے مانگی جائے اور بندہ عفو کا طالب ہو تو ربِ کریم اس کی مغفرت فرما دیتا ہے۔

استغفار کرنے والوں پر رب العالمین نعمتوں کا دروازہ کھولتا ہے؛ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدتِ خاص تک تم کو اچھا سامانِ زندگی دے گا اور ہر صاحبِ فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا''۔ (ھود، ۳)

یعنی آخرت ہی میں نہیں، اس دنیا میں بھی مستغفرین کو مال و متاع عطا کیا جاتا ہے۔ اور صرف فرد ہی نہیں بلکہ قوموں کی زندگی بھی بدل جاتی ہے؛ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم حضرت ھودؑ نے اپنی قوم کو سنایا:

''اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے استغفار کرو، پھر اس کی طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان کے دھانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر اور قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرموں کی طرح منہ نہ کھولو''۔ (ھود، ۵۲)

اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے جو قوم اپنے برے انجام کی جانب بگ ٹٹ چلی جا رہی ہو، اگر وہ اپنی غلطی کو محسوس کر لے اور نافرمانی چھوڑ کر خدا کی بندگی کی طرف پلٹ آئے تو اس کی قسمت بدل جاتی ہے، اس کی مہلتِ عمل میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور مستقبل میں اس کے لیے عذاب کے بجائے انعام، ترقی اور سرفرازی کا فیصلہ لکھ دیا جاتا ہے۔ (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۳۴۶)

نافرمانوں کے لیے استغفار اذنِ رحمت ہے

قرآن کریم میں نافرمان قوموں کو استغفار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، ارشاد ہے:

''دیکھو اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ، بے شک میرا رب رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے''۔ (ھود، ۹۰)

یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر بڑی عنایت ہے کہ وہ جب بھی اپنے افعال پر نادم ہو کر اس کی جانب پلٹتے ہیں اور استغفار کرتے ہیں، تو وہ انہیں اپنے وسیع دامنِ رحمت میں سمیٹ لیتا ہے۔ کیونکہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق سے وہ بے پایاں محبت رکھتا ہے۔

مستغفرین اور پلٹ آنے والوں سے اللہ اسی طرح خوش ہوتا ہے، جس طرح صحرا میں اونٹ گم ہو جانے والا شخص اس کے ملنے پر خوش ہوتا ہے، جس پر اس کا کھانا اور پانی ہو اور وہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مایوس ہو چکا ہو، اور زندگی سے بے آس ہو کر لیٹ گیا ہو، اور عین اس حالت میں دیکھے کہ اس کا اونٹ سامنے کھڑا ہے، تو اس وقت جیسی کچھ خوشی اس کو ہو گی، اس سے بہت زیادہ خوشی اللہ کو اپنے بھٹکے ہوئے بندے کے پلٹ آنے سے ہوتی ہے۔ (دیکھئے: تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۳۶۳)

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو حق کی تبلیغ کی تو انہیں بااصرار علانیہ اور چپکے چپکے سمجھایا: ''میں نے کہا: اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے''۔ (نوح، ۱۰)

قرآن میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے کہ خدا سے بغاوت صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی انسان کو تنگ کر دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا راستہ دنیا میں بھی اس پر نعمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ قرآن مجید کی اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایک مرتبہ قحط کے موقع پر حضرت عمرؓ بارش کی دعا کرنے کے لیے نکلے اور صرف استغفار پر اکتفا فرمایا۔ لوگوں نے عرض کیا: امیر المؤمنین! آپ نے بارش کے لیے تو دعا کی ہی نہیں۔ فرمایا: میں نے آسمان کے ان دروازوں کو کھٹکھٹا دیا ہے جہاں سے بارش نازل ہوتی ہے، اور پھر سورۃ نوح کی یہ آیات لوگوں کو پڑھ کر سنا دیں۔ (ابنِ جریر و ابنِ کثیر)

حسن بصریؒ کی مجلس میں ایک شخص نے قحط سالی کی شکایت کی۔ انہوں نے کہا: اللہ سے استغفار کرو۔ دوسرے شخص نے تنگ دستی کی شکایت کی اور تیسرے نے کہا: میرے ہاں اولاد نہیں ہوتی، چوتھے نے کہا: میری زمین کی پیداوار کم ہو رہی ہے۔ ہر ایک کو انہوں نے استغفار کرنے کی تلقین کی۔ اور جب لوگوں نے اس پر سوال کیا تو آپ نے جواب میں سورۃ نوح کی یہ آیات سنا دیں۔ (کشاف)

دوسروں کے لیے استغفار کرنا

اللہ تعالیٰ نے بندوں کو خود بھی استغفار کی تلقین کی، پیغمبروں نے

بھی اللہ سے مغفرت کی سفارش بھی کی، حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کا معاملہ جب کھل گیا تو انہوں نے والد سے کہا کہ ہمارے لیے اللہ سے معافی مانگیں:

''سب بول اٹھے: ابا جان! آپ ہمارے گناہوں کی بخشش کے لیے دعا کریں، واقعی ہم خطا کار تھے۔ اس نے کہا: میں اپنے رب سے تمہارے لیے معافی کی درخواست کروں گا، وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے''۔ (یوسف، ۹۸۔۹۷)

ابراہیمؑ نے بھی اپنے والد کے لیے استغفار کرنے کا وعدہ کیا تھا:

''ابراہیمؑ نے کہا: سلام ہے آپ کو۔ میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کردے، میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے''۔ (مریم، ۴۷)

اور کہتے ہوئے انہوں نے باپ کو یہ بھی بتادیا تھا: ''میں آپ کے لیے معافی ضرور چاہوں گا، اور میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے کہ آپ کو اللہ کی پکڑ سے بچوالوں''۔ (الممتحنہ، ۴) حضرت ابراہیمؑ نے انتہائی محتاط لہجے میں اس وعدے کے مطابق دعا کی تھی مگر جب آپؑ کی نظر اس جانب گئی، کہ ان کا باپ تو کھلم کھلا خدا کا باغی ہے تو وہ اس دعا سے بھی باز آ گئے اور ایک سچے وفادار مومن کی طرح انھوں نے باغی کی ہمدردی سے صاف صاف تبرّی کردی۔ (دیکھئے: تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۲۴۲)

انبیاء علیہم السلام کا استغفار

انبیاء علیہم السلام گناہوں سے پاک ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرماتا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں جا بجا ایسے واقعات ملتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کے یہ برگزیدہ بندے بھی اس کے حضور رکوع و سجود میں جھکے ہوئے اور اس کے سامنے عاجزی سے کھڑے استغفار کر رہے ہیں، اور معافی اور مغفرت مانگ رہے ہیں۔ حضرت آدم وحواؑ جنت کا پھل کھانے کے بعد اللہ سے مغفرت کے کلمات سیکھ کر دعا مانگتے ہیں: ''اے ربّ، ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے''۔ (الاعراف، ۲۳)

حضرت نوحؑ اپنے کافر بیٹے کو طوفان میں ڈوبتے دیکھ کر اللہ کو پکارتے ہیں، کہ میرے گھر والا ڈوب رہا ہے، اور اس نازک نفسیاتی موقع پر اللہ کی جانب سے احساس دلایا جاتا ہے، ''وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے''۔ (ھود، ۴۶) اور حضرت نوحؑ گڑگڑا کر دعا مانگتے ہیں:

''اے میرے رب! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا''۔ (ھود، ۴۷)

حضرت ابراہیمؑ بڑی عاجزی سے اللہ کے حضور درگزر کی امید رکھتے ہیں: ''اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روزِ جزا وہ میری خطا معاف فرمادے گا''۔ (الشعراء، ۸۲)

حضرت داوودؑ جب دنبیوں والے معاملے میں مبتلائے فتنہ ہو گئے، اور اللہ نے اپنے محبوب بندے کا محاسبہ کیا اور انہیں اپنی تقصیر کا احساس ہوا، تو فوراً اسی رب کی جانب پلٹ کر اس سے معافی مانگ لی۔ ان کی کیفیت کو قرآن میں بیان کیا گیا ہے: ''(یہ بات کہتے کہتے) داوودؑ سمجھ گیا کہ یہ تو ہم نے دراصل اس کی آزمائش کی ہے، چنانچہ اس نے اپنے رب سے معافی مانگی اور سجدے میں گر گیا اور رجوع کرلیا''۔ (ص، ۲۴)

حضرت سلیمانؑ کو بھی آزمائش میں ڈالا گیا، جب ان کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈالا گیا تو وہ فوراً اپنی لغزش پر متنبہ ہو گئے اور اپنے رب سے معافی مانگ کر اپنی اس بات سے رجوع کرلیا جس کی وجہ سے وہ فتنے میں پڑے تھے، اور دعا کی: ''اے میرے رب مجھے معاف کردے اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی اور کے لیے سزاوار نہ ہو، بے شک تو ہی اصل داتا ہے''۔ (ص، ۳۵)

حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں قبطی مارا گیا تو انہوں نے اللہ سے اس لغزش کی معافی مانگی: ''پھر وہ کہنے لگا: اے میرے رب! میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا، میری مغفرت فرمادے''۔ (القصص، ۱۶)

اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ انبیاء و رسل کی منتہائے آرزو ہے کہ اللہ قیامت کے دن ان کی خطائیں معاف کردے، حالانکہ وہ اللہ کو سب سے بڑھ کر پہچانتے ہیں، اور ان کے نفس کی گہرائیوں میں رب کی معرفت رچی بسی ہے، اس معرفت اور قرب کے ساتھ بھی وہ اللہ سے ڈرتے ہیں کہ ان

سے کوئی خطا ہوئی ہو۔ وہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہیں کرتے، وہ فضلِ ربی پر بھروسہ کرتے ہیں، اور اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں کہ عفو ودرگزر ہوگا تب ہی ان کی نجات ہوگی۔ اس شعور کے مطابق عمل کی قیمت بہت ہی کم ہے اور مغفرت کی قیمت زیادہ ہے۔ (دیکھئے: فی ظلال القرآن، نفس الآیۃ)

اگر اللہ تعالیٰ کے ان برگزیدہ بندوں کا یہ حال ہے تو پھر ایک مومن کو اپنے رب سے کس قدر مغفرت مانگنے کی ضرورت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا استغفار

رسول اللہ ﷺ کی حیات میں استغفار کا مستقل حصّہ تھا اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بخش دیا تھا۔ حضرت اغر المزنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے دل پر بھی (بعض اوقات) پردہ سا آجاتا ہے اور میں دن میں سو ۱۰۰ مرتبہ اللہ سے استغفار کرتا ہوں''۔ (رواہ مسلم، ۴۹۷۷)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم میں ایک دن میں ستر سے زائد مرتبہ اللہ سے استغفار کرتا اور اس سے توبہ کرتا ہوں''۔ (رواہ البخاری، ۵۹۵۷)

حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص استغفار کی پابندی کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر تنگی سے نکلنے کا راستہ بنا دیتا اور ہر غم سے اسے نجات عطا کرتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا''۔ (رواہ ابن ماجہ، ۳۸۱۷)

حضرت شداد بن اوسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا: بندے کا یوں پکارنا سید الاستغفار ہے، ''اے اللہ تو میرا رب ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو نے ہی مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں اور میں جہاں تک طاقت رکھتا ہوں تیرے عہد اور وعدے پر قائم ہوں اور میں اپنے کئے ہوئے عمل کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں، میں ان نعمتوں کا اقرار کرتا ہوں جو تو نے مجھ پر کیں اور اپنے گناہوں کا بھی اعتراف کرتا ہوں، پس تو مجھے معاف کر دے، بے شک تیرے سوا کوئی گناہوں کو معاف کرنے والا نہیں''۔ جو شخص یہ کلمات استغفار دن میں دل کے یقین سے کہے اور شام ہونے سے پہلے اسے موت آجائے، تو وہ جنتی ہے اور جو اسے یقین کے ساتھ رات کو پڑھے اور صبح ہونے سے پہلے اسے موت آجائے، تو وہ جنتی ہے۔ (رواہ البخاری، ۶۳۲۳)

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ (سلام پھیر کر) اپنی نماز سے فارغ ہوتے تو تین مرتبہ استغفار فرماتے اور یہ دعا مانگتے: اے اللہ تو سلام ہے، اور سلامتی تیری ہی طرف سے ملتی ہے۔ اے عزت اور جلال کے مالک، تو بڑی برکتوں والا ہے''۔ (رواہ مسلم)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اے ابنِ آدم! جب تک تو مجھے پکارتا رہے گا اور مجھ سے امید وابستہ رکھے گا، تو تو جس حالت پر بھی ہوگا میں تجھے معاف کرتا رہوں گا اور میں کوئی پروانہ کروں گا۔ اے ابنِ آدم! اگر تیرے گناہ آسمان تک پہنچ جائیں، پھر تو مجھ سے معافی طلب کرے (استغفار کرے) تو میں تجھے بخش دوں گا اور میں کوئی پروانہیں کروں گا۔ اے ابنِ آدم! اگر تو زمین بھر گناہوں کے ساتھ میرے پاس آئے، پھر تو مجھے اس حال میں ملے کہ تو نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو، تو میں بھی اتنی مغفرت کے ساتھ تجھے ملوں گا جس سے زمین بھر جائے''۔ (رواہ مسلم، ۵۰۶۰)

سلف صالحین کے اقوال

حضرت قتادہؒ کا قول ہے: ''بے شک قرآن تمہارے امراض کی نشاندہی بھی کرتا ہے اور ان کی دوا بھی بتاتا ہے، تو تمہارے امراض تمہارے گناہ ہیں، اور ان کی دوا استغفار ہے''۔

حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے: ''اپنے گھروں، دسترخوان، اپنی گزرگاہوں اور بازاروں اور اپنی مجلسوں اور جہاں بھی تم جاؤ، کثرت سے استغفار کرو، کیونکہ تم نہیں جانتے کہ کب مغفرت نازل ہو جائے''۔

ابی المنہالؒ نے کہا: ''قبر میں ہم نشینی کے لیے کثرتِ استغفار سے بڑھ کر کوئی ساتھی نہیں''۔

استغفار کا طریقہ یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کی حمد وثنا بیان کرے،

پھر اپنے گناہوں کا اعتراف کرے، اور اللہ سے مغفرت طلب کرے۔

استغفار کی کیفیت

استغفار مومن کی ڈھال بھی ہے اور اس کی امان بھی، روز وشب کی مشغولیات میں مومن کی سب سے بڑی فکر یہ ہے کہ اس سے کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہو جو اللہ کی ناراضی کا سبب بنے، اور اس کے نیک اعمال میں ایسی کمی نہ رہ جائے کہ وہ قبولیت کا درجہ نہ پا سکے۔ اسی لیے وہ ہر عمل کے دوران اور اس کے مکمل ہونے پر عفو اور مغفرت اور اللہ سے معافی کا خواہستگار رہتا ہے۔ ایمان لانے کے ساتھ ہی اس کی دعا ہوتی ہے کہ اے ارحم الراحمین میری مغفرت فرما دے۔ اللہ کی کائنات کی سیر کرتے ہوئے جب سبحان اللہ کہتا ہے تو بھی مغفرت مانگتا ہے۔ ہر نماز کا اختتام اپنی والدین اور تمام مومنوں کی مغفرت مانگنے پر کرتا ہے، اور سلام پھیر کر نماز مکمل کرتا ہے تو سب سے پہلے تین مرتبہ استغفر اللہ کہتا ہے۔ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں استغفار مزید بڑھ جاتا ہے، اور حج کی تیاری کے مراحل ہی میں معافی اور استغفار کی دعائیں کسی قیمتی توشے کی مانند اس کے ہمراہ ہوتی ہیں۔ کسی مصیبت میں گھر جائے تو دعائے یونسؑ مانگتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا، سخت سزا دینے والا اور بڑا صاحبِ فضل معبود وہی ایک اللہ ہے۔

استغفار کے فوائد

استغفار کے ثمرات انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بھی بعض کا تذکرہ فرمایا ہے، جیسے استغفار کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ عمدہ بارش برساتے ہیں اور نہریں اور باغات عطا فرماتے ہیں، اور مستغفرین کو رزق اور مال و اولاد سے نوازتے ہیں۔ استغفار کرنے والوں کے لیے اللہ کی اطاعت اختیار کرنا اور اس کی مرضی کی راہ اختیار کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور استغفار کرنے والے بندے کا اللہ سے تعلق بہت مضبوط ہو جاتا ہے، وہ شیطان سے دور ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے دل میں ایمان کی حلاوت محسوس کرتا ہے، اس کی زندگی سے رنج اور غم دور ہو جاتے ہیں۔ ہر بار قصور سرزد ہونے پر جب وہ اللہ سے استغفار کر لیتا ہے تو اس کی رحمت اور عفو کے دائرے میں شامل ہو جاتا ہے، وہ توبہ کی خوشی اور لذت پر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ موت کے وقت اسے ملائکہ بھی خوشخبری سنائیں گے اور وہ قیامت کے دن اللہ کے عرش کے سائے میں ہوگا۔

استغفار کرنے والوں پر ابلیس کا رنج

یہ بات ابلیس کے غیض وغضب کو بڑھاتی ہے کہ وہ انسان جسے اس نے اتنے حیلوں اور مکاریوں سے گناہ پر آمادہ کیا، اور وہ اس سے گناہ کا ارتکاب کروانے میں کامیاب ہو گیا، اور اس نے اسے اللہ کی رحمت اور مغفرت سے ایسا مایوس کر دیا کہ وہ اللہ کی اطاعت کے دائرے سے باہر نکل آیا اور حرام کی سواری پر بگ ٹٹ بھاگنے لگا، حتیٰ کہ کفر کا ارتکاب کر بیٹھا۔ اور پھر ان تمام آلائشوں سے نجات کے لیے اس نے اللہ کی پناہ میں جانے کا ارادہ کر لیا اور ''اعوذ باللہ'' کہا، اور برے اعمال سے دور ہٹنے کے لیے یہی انسان کا سب سے بڑا اسلحہ ہے جو اس کے نفس کو بچا لیتا ہے۔ اور استغفار کو لازم کر لینا اور گناہوں پر توبہ کرتے رہنا اسے شیطان مردود سے دور کر دیتا ہے۔ جو ایسا کر لے وہی اپنے نفس کے لیے مجاہدہ کرنے والا ہے۔

استغفار کرنے والا اپنے عام و خاص ہر طرح کے قصوروں کی معافی مانگتا ہے، گناہوں کے ارتکاب پر شرمندہ ہوتا ہے، اور عمل کی کوتاہی اور کمی پر بھی اللہ ہی سے مغفرت مانگتا ہے۔ خواتیمِ اعمال پر مغفرت انبیاء وصالحین کا طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ النصر میں اس کی تعلیم دی، اور رسول اللہؐ نے آخری زمانے میں استغفار کو اور زیادہ بڑھا دیا۔

اللہ تعالیٰ معافی مانگنے والوں کا ذکر بھی بڑے پیارے شفقت بھرے انداز میں کرتا ہے اور فرماتا ہے: ''ہم ان کی طرف پلٹے تاکہ وہ پلٹ آئیں''، یعنی آقا نے ان کی معصیت کے سبب ان سے نگاہ پھیر لی تھی، مگر جب وہ بندے قصور سرزد ہونے کے بعد بھاگے نہیں بلکہ دل شکستہ ہو کر اسی کے در پر بیٹھ گئے تو ان کی شانِ وفاداری دیکھ کر آقا سے خود نہ رہا گیا۔ جوشِ محبت سے بے قرار ہو کر وہ آپ نکل آیا تاکہ انہیں دروازے سے اٹھا لے۔ (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات، ص ۱۵، ۱۶)

خالق تعالیٰ ہمیں استغفار کرنے والوں میں شامل کر لے۔ آمین☆

ڈاکٹر محمد عبدالحئی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز

حضرت عبداللہ بن قرطؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے اول جس چیز کا سوال بندہ سے ہوگا وہ نماز ہے اگر وہ ٹھیک اتری تو اس کے سارے اعمال ٹھیک اتریں گے اور اگر وہ خراب نکلی تو اس کے سارے اعمال خراب نکلیں گے۔ (طبرانی اوسط حیٰوۃ المسلمین)

حضرت عبادہ بن الصامتؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ نے ارشاد فرمایا کہ پانچ وقت کی نمازیں اللہ تعالیٰ نے فرض کی ہیں جس نے ان کے لیے اچھی طرح وضو کیا اور ٹھیک وقت پر ان کو پڑھا اور رکوع وسجود بھی جیسے کرنا چاہیے ویسے ہی کئے اور خشوع کی صفت کے ساتھ ان کو ادا کیا تو ایسے شخص کے لیے اللہ تعالیٰ کا پکا وعدہ ہے کہ وہ اس کو بخشش دے گا اور جس نے ایسا نہیں کیا (اور نماز کے بارے میں اس نے کوتاہی کی) تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا کوئی وعدہ نہیں ہے چاہے گا تو اس کو بخشش دے گا اور چاہے گا تو سزا دے گا (معارف الحدیث، مسند احمد، سنن ابی داؤد)

پنجگانہ فرض نمازوں کے اوقات

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ ایک صاحب نے رسول اللہؐ سے نماز کے اوقات کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ ان دونوں دن (آج اور کل) تم ہمارے ساتھ نماز پڑھو۔ پھر (دوپہر کے اندر) جیسے ہی آفتاب ڈھلا۔ آپ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا اور انہوں نے اذان دی۔ پھر آپؐ نے ان سے فرمایا تو انہوں نے ظہر کی نماز کے لیے اقامت کہی (اور ظہر کی نماز پڑھی گئی) پھر (عصر کا وقت آنے پر) آپؐ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا تو انہوں نے (قاعدہ کے مطابق پہلے اذان اور پھر) عصر کی نماز کے لیے اقامت کہی (اور عصر کی نماز ہوئی) یہ اذان اور پھر یہ نماز ایسے وقت ہوئی کہ آفتاب خوب اونچا اور پوری طرح روشن تھا (یعنی اس کی روشنی میں وہ فرق نہیں پڑا تھا جو شام کو ہو جاتا ہے) پھر آفتاب غروب ہوتے ہی آپؐ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا تو انہوں نے مغرب کی (قاعدہ کے مطابق اذان کہی پھر) اقامت کہی (اور مغرب کی نماز ہوئی) پھر جیسے ہی شفق غائب ہوئی تو آپؐ نے ان کو حکم دیا تو انہوں نے عشاء کی (قاعدے کے مطابق اذان کہی پھر) اقامت کہی اور (عشاء کی نماز پڑھی گئی) پھر رات کو ختم ہونے پر جیسے ہی صبح صادق نمودار ہوئی۔ آپؐ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا اور انہوں نے فجر کی (قاعدے کے مطابق اذان کہی پھر اقامت کہی (اور فجر کی نماز پڑھی گئی) پھر جب دوسرا دن ہوا تو آپؐ نے حضرت بلالؓ کو ٹھنڈے وقت ظہر کی نماز قائم کرنے کا حکم دیا اور فرمایا ظہر آج (تاخیر کر کے) ٹھنڈے وقت پڑھی جائے تو آپ کے حسب حکم انہوں نے ٹھنڈے وقت ظہر کی اذان پھر اقامت پڑھی اور خوب اچھی طرح ٹھنڈا وقت کر دیا۔ (یعنی کافی تاخیر کر کے ظہر اس دن بالکل آخری وقت پڑھی گئی اور عصر کی نماز ایسے وقت پڑھی کہ آفتاب اگرچہ اونچا ہی تھا لیکن گزشتہ روز کے مقابلہ میں زیادہ موخر کر کے پڑھی اور عشاء تہائی رات گزر جانے کے بعد پڑھی اور فجر کی نماز اسفار کے وقت میں (یعنی دن کا اجالا پھیل جانے پر) پڑھی پھر آپؐ نے فرمایا وہ صاحب کہاں ہیں جو نماز کے اوقات کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ اس شخص نے عرض کیا میں حاضر ہوں یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا تمہاری نمازوں کا مستحب وقت اس کے درمیان میں ہے جو تم نے دیکھا۔ (صحیح مسلم، معارف الحدیث)

نماز فجر: حضرت رافع بن خدیجؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ نماز فجر اسفار میں ادا کرو (یعنی صبح کا اجالا پھیل جانے پر فجر کی نماز پڑھو) کیونکہ اس میں زیادہ اجر وثواب ہے۔ (سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، مسند دارمی، معارف الحدیث)

نماز ظہر: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جب گرمی سخت ہو تو ظہر کو ٹھنڈے وقت پڑھا کرو۔ (صحیح بخاری)

نماز عشاء: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک بار حضور اکرمؐ عشاء کی نماز کے لیے اس وقت باہر تشریف لائے جب تہائی رات ہو چکی تھی آپؐ نے فرمایا کہ اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ میری امت کے لیے یہ وقت بھاری اور مشکل ہو جائے گا تو میں یہ نماز (ہمیشہ دیر کر کے) اسی وقت پڑھایا کرتا کیونکہ اس نماز کے لیے ہمیشہ یہی وقت افضل ہے۔ (صحیح مسلم، معارف الحدیث)

نماز میں تاخیر کی ممانعت

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: علی! تین کام وہ ہیں جن میں تاخیر نہ کرنا:

(۱) نماز جب اس کا وقت آجائے۔ (۲) جنازہ جب تیار ہو کر آجائے (۳) بے شوہر والی عورت جب اس کے لیے کوئی مناسب جوڑ مل جائے۔ (جامع ترمذی، معارف الحدیث)

سونے یا بھول جانے کی وجہ سے نماز قضا ہو جائے

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا جو کوئی نماز کو بھول گیا یا نماز کے وقت سوتا رہ گیا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب یاد آئے یا سو کے اٹھے اسی وقت پڑھ لے۔ (معارف الحدیث، صحیح بخاری و صحیح مسلم)

نماز میں تساہل

حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے مجھ سے فرمایا تمہارا کیا حال ہوگا اور کیا رویہ ہوگا جب ایسے (غلط کار اور خدا ناترس) لوگ تم پر حکمران ہوں گے جو نماز کو مردہ اور بے روح کریں گے۔ (یعنی ان کی نمازیں خشوع اور آداب کے اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے بے روح ہوں گی) یا وہ نمازوں کو ان کے صحیح وقت کے بعد پڑھیں گے؟ میں نے عرض کیا تو آپؐ کا میرے لیے کیا حکم ہے یعنی ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپؐ نے فرمایا تم وقت آجانے پر اپنی نماز پڑھ لیا کرو۔ اس کے بعد اگر ان کے ساتھ نماز پڑھنے کا موقع آئے تو ان کے ساتھ پڑھ لو۔ یہ تمہارے لیے نفل ہو جائے گی۔ (معارف الحدیث، صحیح مسلم)۔

دوسری نماز کا انتظار

ایک بار مغرب کی نماز کے بعد کچھ لوگ عشاء کی نماز کا انتظار کر رہے تھے نبی کریمؐ تشریف لائے اور آپؐ اس قدر تیز تیز چل کر آئے کہ آپ کی سانس پھول گئی تھی آپؐ نے فرمایا: لوگو! خوش ہو جاؤ تمہارے رب نے آسمان کا دروازہ کھول کر تمہیں فرشتوں کے سامنے کیا اور فخر کے طور پر فرمایا دیکھو! یہ میرے بندے ایک نماز ادا کر چکے ہیں اور دوسری نماز کا انتظار کر رہے ہیں۔ (ابن ماجہ)

جمع بین الصلوٰتین

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو کبھی نہیں دیکھا کہ آپؐ نے اس کے غیر وقت میں کوئی نماز پڑھی ہو مگر مغرب و عشاء کی دو نمازوں میں جن کو مزدلفہ میں جمع فرمایا اور احادیث میں عرفات میں ظہر و عصر کی نمازیں بھی جمع فرمانا مروی ہے اور یہ جمع بر بنائے مناسک حج تھی، نہ کہ سفر کی وجہ سے، جامع الاصول میں بروایت ابوداؤد حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ نبی کریمؐ نے کبھی سفر میں مغرب و عشاء کو ملا کر نہیں پڑھا مگر ایک مرتبہ۔ جمع بین الصلوٰتین کے معنی یہ ہیں کہ پہلی نماز کو اتنا موخر کیا جائے کہ اسے اس کے آخری وقت میں پڑھا جائے اور دوسری نماز میں اتنی تعجیل کی جائے کہ اسے اس کے شروع میں پڑھا جائے اور بعض اسے جمع صوری کا نام دیتے ہیں کیونکہ یہ ظاہر صورت میں تو جمع ہے مگر درحقیقت جمع نہیں ہے اور یہی وہ صورت ہے جس پر احناف سفر میں جمع کا اطلاق کرتے ہیں۔ (مدارج النبوۃ)

جامع الاصول میں ابوداؤد سے بروایت نافع اور عبداللہ بن واقدی سے مروی ہے کہ ایک بار سفر میں حضرت ابن عمرؓ سے موذن نے کہا "الصلوٰۃ" ابن عمرؓ نے فرمایا چلتے رہو، یہاں تک کہ غروب شفق سے پہلے اترے اور نماز مغرب ادا کی اس کے بعد انتظار کیا یہاں تک کہ شفق غائب ہو گئی۔ پھر عشاء کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد فرمایا کہ رسول اللہؐ کو سفر میں جلدی ہوتی تھی تو آپؐ یہی فرماتے اور یہی حکم دیتے جیسا کہ میں نے کیا ہے۔ (مدارج النبوۃ)

نماز کے اوقات ممنوعہ

احادیث میں روایت ہے کہ حضور اکرمؐ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے اور اس تکبیر تحریمہ کے ساتھ دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھاتے

اوراس کے بعد ہاتھ باندھ لیتے اس طرح کہ داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی کلائی پر رکھتے۔

ہاتھ باندھنے کے بعد ثناء پڑھتے سبحانك اللهم

اس کے بعد اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھتے۔اس کے بعد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے پھر اس کے بعد سورہ فاتحہ پڑھتے اور اس کے آخر میں آمین کہتے۔

(امام اعظمؒ کے مذہب میں آمین آہستہ کہنا ہے)۔

سیدنا عمرؓ سے روایت ہے کہ امام چار چیزوں میں اخفا کرے یعنی آہستہ سے کہے،تعوذ،بسم اللہ،آمین اور سبحانك اللهم

پھر حضورؐ سورہ فاتحہ کے بعد کوئی سورت پڑھتے۔پھر آپؐ جب اس کی قرأت سے فارغ ہوتے تو تکبیر کہتے ہوئے رکوع میں جاتے (جھکنے کے ساتھ ہی تکبیر کہتے)۔

اسی طرح جب رکوع سے سر اٹھاتے تو سمع اللہ لمن حمدہ فرماتے۔

رکوع میں دونوں ہتھیلیوں کو گھٹنوں پر خوب جماتے اور انگلیوں کو کھول کر رکھتے (علماء فرماتے ہیں کہ نماز میں انگلیوں کی تین حالتیں ہیں ایک رکوع کی حالت میں کھول کر رکھنا دوسرے سجدے کی حالت میں انگلیوں کو ملا کر رکھنا چاہیے۔تیسرے تمام حالتوں میں انگلیوں کو اپنے حال پر چھوڑنا خواہ قیام کی حالت ہو خواہ تشہد کی ہو)۔

حضورؐ رکوع میں بازوؤں کو پہلو سے دور رکھتے اور اپنی پشت کو سیدھا رکھتے اور سر کو اس کے برابر، نہ نیچا کرتے اور نہ اٹھاتے اور تین بار سبحان ربی العظیم کہتے (یہ کم از کم ہے بسا اوقات آپ اس سے بھی زیادہ کہتے تھے اور زیادہ مرتبہ کہنا طاق عدد افضل ہے) اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو سجدہ میں اس وقت تک نہ جاتے جب تک کہ سیدھے کھڑے نہ ہو جاتے اور آنحضرتؐ سجدے اسی انداز سے کرتے۔آپ جب سجدے میں جاتے تو ہاتھوں سے پہلے گھٹنوں کو زمین پر رکھتے۔اس کے بعد ہاتھوں کو رکھتے۔پھر پہلے بنی (ناک) زمین پر رکھتے، پھر پیشانی مبارک رکھتے۔سجدے میں بازوؤں اور پیٹ کو رانوں سے دور رکھتے اتنا کہ بکری کا بچہ اس کے درمیان سے گزر سکتا تھا۔

سجدے میں سر مبارک کو دونوں ہتھیلیوں کے درمیان میں رکھتے۔

سجدے میں پاؤں کی انگلیوں کا رخ قبلہ کی جانب ہوتا تھا۔

سجدے میں کم از کم تین بار سبحان ربی الاعلیٰ کہتے اور جب سجدے سے سر اٹھاتے تو جب تک بالکل سیدھے نہ بیٹھ جاتے دوسرا سجدہ نہ فرماتے۔

جب قیام طویل ہوتا تو رکوع وسجدہ اور جلسہ بھی طویل ہوتا اور جب قیام مختصر ہوتا تو یہ سب مختصر ہوتے۔(مدارج النبوۃ)

آپ ہر دو رکعت پر التحیات پڑھتے تھے۔(صحیح مسلم)

حضرت وائلؓ کی حدیث میں ہے کہ آپؐ جب سجدہ سے (قیام کے لیے کھڑے ہوتے تو رانوں اور گھٹنوں پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے اور سنت یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھے اور اسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کھڑا ہو جائے اور حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے کھڑے ہوتے وقت زمین پر ہاتھوں سے ٹیک لگا کر کھڑے ہونے کو منع فرمایا ہے (لیکن بحکم ضروریات زیادتی مشقت، کبر سنی اور کمزوری کے وقت زمین پر ٹیک لگانا جائز ہے) (مدارج النبوۃ)

اور جب حضورؐ تشہد میں بیٹھتے تو بایاں پاؤں بچھاتے اور اس پر بیٹھتے اور داہنا پاؤں کھڑا رکھتے اور جب آخری رکعت کے بعد تشہد کے لیے بیٹھتے تو قعدہ اولیٰ کی طرح بیٹھتے اور جب تشہد پڑھتے تو دونوں ہاتھوں کو دونوں رانوں پر رکھتے اور داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت سے اشارہ کرتے (اس کی صورت یہ ہے کہ چھنگلی اور اس کے پاس کی انگلی ہتھیلی کے اندر جمع کر کے اور بیچ کی انگلی اور انگوٹھے سے حلقہ بنائے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرے اور جب لا الہ کہے تو انگلی اٹھائے اور الا اللہ کہنے پر نیچے کرے۔(مدارج النبوۃ)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے

اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّيِّبٰتُ
اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ
اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ اَشْهَدُ اَنْ
لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

کہ حضور اکرمؐ نے ہمیں تعلیم فرمائی کہ ہم ان الفاظ میں التحیات پڑھیں۔(رواہ مسلم، معارف الحدیث)

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ سے مروی ہے کہ مجھے کعب بن عجرہؓ ملے تو انہوں نے کہا کیا میں تمہیں ایک تحفہ جسے میں نے حضورؐ سے سنا پیش کردوں میں نے فرمایا ہاں ضرور تو انہوں نے فرمایا حضورؐ سے میں نے عرض کیا کہ آپ نے ہمیں آپؐ پر سلام بھیجنے کا طریقہ تو بتا دیا لیکن ہم درود کس طرح بھیجیں تو آپؐ نے فرمایا ان الفاظ میں:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰٓی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ۔ عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ (بخاری و مسلم، معارف الحدیث)

ایک دوسرے صحابی حضرت ابو مسعود انصاریؓ سے بھی قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث مروی ہے جس میں جب حضورؐ سے درود کے متعلق دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ جب ہم نماز میں آپؐ پر درود پڑھیں تو کس طرح پڑھیں تو آپ نے مذکورہ درود شریف کی تلقین فرمائی (مدارج النبوۃ)

امام طبرانی، امام ابن ماجہ اور امام دار قطنیؒ، حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ اس شخص کی نماز ہی نہیں جو اپنے نبی پر درود نہ بھیجے۔ (مدارج النبوۃ)

درود شریف کے بعد اور سلام سے پہلے دعا

مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے کہ نماز تشہد کے بعد درود شریف پڑھے اور اس کے بعد دعا کرے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ کی ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے تشہد کی تلقین والی حدیث کے آخر میں رسول اللہؐ کا یہ ارشاد بھی مروی ہے یعنی نمازی جب تشہد پڑھ چکے تو دعا اسے اچھی معلوم ہو اس کا انتخاب کر لے اور اللہ تعالیٰ سے وہی دعا مانگے۔ (معارف الحدیث)

درود شریف کے بعد نماز میں دعا آنحضرت سے تعلیماً بھی ثابت ہے اور عملاً بھی۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی آخری تشہد پڑھ کے فارغ ہو جائے تو اسے چاہیے کہ چار چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے۔ (صحیح مسلم)

نبی کریمؐ درود شریف کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے:

اے اللہ! میں آپ سے قبر کے عذاب کی پناہ چاہتا ہوں اور مسیح و دجال کے فتنہ سے پناہ چاہتا ہوں اور موت و حیات کے فتنہ سے پناہ چاہتا ہوں اور گناہ سے اور (بلا وجہ) تاوان بھگتنے سے پناہ چاہتا ہوں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ اس دعا کی تعلیم اس طرح ہم کو دیتے تھے جس طرح قرآن کی سورت کی تعلیم دیتے تھے (صحیح مسلم و بخاری، مدارج النبوۃ)

نبی کریمؐ تشہد کے بعد (نماز کے آخر میں) داہنے اور بائیں سلام پھیرتے اور اپنی چشم مبارک نماز میں کھلی رکھتے تھے بند نہ کرتے تھے (صحیح مسلم، مدارج النبوۃ)

سجدہ سہو

(۱) نماز میں جتنی چیزیں واجب ہیں ان میں سے ایک واجب یا کئی واجب اگر بھولے سے رہ جائیں تو سجدہ سہو کرنا واجب ہے۔ اس کے کر لینے سے نماز درست ہو جاتی ہے۔ اگر سجدہ سہو نہیں کیا تو نماز پھر سے پڑھے۔ (بہشتی زیور)

(۲) اگر بھولے سے نماز کا کوئی فرض چھوٹ جائے تو سجدہ سہو کرنے سے نماز درست نہیں ہوگی پھر سے پڑھے۔ (ردالمختار)

(۳) سجدہ سہو کا طریقہ یہ ہے کہ اخیر رکعت میں فقط التحیات پڑھ کر داہنی طرف ایک سلام پھیر کر دو سجدے کرے پھر بیٹھ کر التحیات اور درود شریف اور دعا پڑھ کر دونوں طرف سلام پھیرے اور نماز ختم کرے۔ (فتاویٰ ہندیہ و شرح الہدایہ)

اگر بھولے سے سلام پھیرنے سے پہلے ہی سجدہ سہو کر لیا تب بھی ادا ہو گیا اور نماز صحیح ہو گئی۔ (شراح البدایہ طحطاوی، بہشتی زیور)

نماز کے بعد کے معمولات

حضورؐ کا یہ معمول تھا کہ آپ جب سلام پھیرتے تو تین بار استغفر اللہ، کہتے اور پھر اللھم انت السلام ومنك السلام تبارکت یا ذالجلال ولاکرام۔ (اے اللہ! تو سلام ہے اور تجھ سے ہی سلامتی ہے اے بزرگی اور عزت والے تو برکت والا ہے) پڑھتے۔ (زادالمعاد)

صرف اتنا کہنے کی حد تک قبلہ رخ رہتے اور پھر مقتدیوں کی

طرف تیزی سے منتقل ہو جاتے اور اپنے دائیں بائیں جانب (رخ انور) پھیر لیتے اور ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ کو کئی بار بائیں رخ ہو جاتے دیکھا اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو کثرت سے دائیں رخ پر دیکھا۔

نمازوں کے بعد کی خاص دعائیں

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ہر فرض نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو تنہا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں اسی کے لیے ملک ہے اور اسی کے لیے سب تعریفیں ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ! جو تو دے اس کا کوئی روکنے والا نہیں اور جو تو روکے اس کا کوئی دینے والا نہیں اور کسی مالدار کو تیرے عذاب سے مالداری نہیں بچا سکتی۔ (بخاری، مسلم، مشکوۃ)

امام نویؒ فرماتے ہیں کہ نماز میں سلام پھیرنے کے بعد تمام انواع ذکر پر روایت کردہ استغفار کو مقدم رکھنا چاہیے۔ اس کے بعد اللھم انت السلام۔ الخ پڑھنا چاہیے پھر اس کے بعد مذکورہ بالا دعا پڑھنا چاہیے (مدارج النبوۃ)

حضورت نبی کریمؐ دعا کے شروع میں اور کبھی دعا کے درمیان میں اکثر ان الفاظ کا اضافہ فرماتے:

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

اے ہمارے رب! دنیا میں ہمیں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

حضرت ثوبانؓ فرماتے ہیں کہ رسولؐ جب نماز سے سلام پھیرتے تو تین بار استغفر اللہ کہتے پھر مذکورہ بالا دعا پڑھتے (مسلم، معارف الحدیث)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ جب نماز سے فارغ ہو جاتے تو اپنا داہنا ہاتھ سر پر پھیرتے اور فرماتے:

میں نے اللہ کے نام کے ساتھ نماز ختم کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں (اور جو رحمٰن و رحیم ہے اے اللہ تو مجھ سے فکر اور رنج کو دور فرما۔ (بزار، طبرانی، ابن سنی، حصن حصین)

حضورؐ کا ہر نماز کے بعد معوذتین پڑھنا بھی آیا ہے اور یہ حدیث حد درجہ صحیح ہے اور ہر نماز کے بعد دس مرتبہ قل ھو اللہ احد پڑھنا بھی آیا ہے۔ اس میں فضل عظیم ہے۔ (مدارج النبوۃ)

حضرت ابو بکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ ہر نماز کے بعد یہ دعا کیا کرتے تھے۔

اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں کفر سے اور فقر و فاقہ سے اور قبر کے عذاب سے (جامع ترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب شام یا صبح ہوتی تو رسول اللہؐ یہ دعا ضرور فرمایا کرتے تھے۔

اے میرے اللہ! میں اپنے دین و دنیا اور اپنے اہل و مال میں تجھ سے معافی و عافیت کا طلب گار ہوں۔ (معارف الحدیث)

حضورؐ کی نماز کی کیفیت

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدسؐ اس درجہ نوافل پڑھا کرتے تھے کہ پاؤں مبارک پر ورم آجاتا تھا۔ کسی نے عرض کیا کہ جب آپؐ پر اگلے پچھلے سب گناہوں کی معافی کی بشارت نازل ہو چکی ہے تو پھر آپؐ اس درجہ مشقت کیوں برداشت فرماتے ہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: افلا اکون عبدا شکورا (کہ جب حق تعالیٰ جل شانہ نے مجھ پر اتنا انعام فرمایا تو کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟) شمائل ترمذی)

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ (خصائل نبوی)

حضرت عوف بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ایک رات میں حضور کے ساتھ تھا۔ حضور خواب استراحت سے بیدار ہوئے مسواک کی اور وضو کر کے نماز کے لیے کھڑے ہو گئے تو میں بھی نماز کے لیے حضور کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ پھر آپؐ نے سورہ بقرہ کی تلاوت شروع فرمائی تو کوئی رحمت والی آیت ایسی نہ گزری جس میں حضور نے توقف کر کے اللہ کے حضور رحمت کی درخواست نہ کی ہو اور ایسی کوئی عذاب والی آیت نہ گزری جس میں حضورؐ نے توقف کر کے اللہ کے حضور اس کے عذاب سے پناہ نہ مانگی

ہو (نفلی نمازوں میں اس طرح رک کر دعا کرنا جائز ہے، بشرطیکہ عربی میں ہو لیکن فرض نمازوں میں ایسا کرنا درست نہیں) پھر آپؐ نے قیام کے برابر طویل رکوع فرمایا اور پڑھا سبحان ذی الجبروت والملکوت و العظمۃ و الکبریاء پھر رکوع سے سر مبارک اٹھا کر اتنا ہی قیام فرمایا اور اس میں بھی یہی کلمات پڑھے۔ اس کے بعد سجدہ کیا اور اس میں بھی یہی کلمات پڑھتے۔ پھر دونوں سجدوں کے درمیان جلوس فرمایا اور اس میں بھی اس کے مانند کلمات ادا فرمائے۔ اس کے بعد بقیہ رکعتوں میں سورۃ آل عمران، سورہ نساء اور سورہ مائدہ تلاوت فرمائی۔ (شمائل ترمذی)

ام المومنین سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ ایک رات تہجد میں ایک ہی آیت کی تکرار فرماتے رہے وہ آیت یہ تھی۔

اگر آپ ان کو عذاب دیں تو بیشک وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ انہیں معاف فرما دیں تو آپ ہی زبردست حکمت والے ہیں۔ (خصائل نبوی)

حضور کی خاص نمازیں

حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ ام المومنین سیدہ عائشہؓ سے عرض کیا کہ حضورؐ کی کوئی عجیب ترین بات سنائیں۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ حضور اکرمؐ کی کونسی بات ایسی تھی جو عجیب ترین نہ تھی اس کے بعد فرمانے لگیں:

ایک رات کا قصہ ہے کہ سونے کے لیے مکان پر تشریف لائے اور میرے پاس میرے لحاف میں لیٹ گئے۔ لیٹتے ہی تھوڑی سی دیر میں فرمایا کہ چھوڑو تا کہ میں اپنے رب کی عبادت کروں یہ فرما کر کھڑے ہو گئے وضو کیا اور نماز کی نیت باندھ لی اور رونا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ سینہ مبارک تک آنسو بہہ کر آنے لگے اس کے بعد رکوع کیا اس میں بھی روتے رہے۔ غرض صبح تک یہی کیفیت رہی حتیٰ کہ حضرت بلالؓ صبح کی نماز کے لیے بلانے کو آ گئے۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ آپ اس قدر کیوں روئے اللہ جل شانہ نے تو آپؐ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف فرما دیے۔ آپ نے فرمایا کہ تو کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ اس کے بعد ارشاد فرمایا میں ایسا کیوں نہ کرتا حالانکہ آج مجھ پر یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ اس کے بعد آپ نے ان فی خلق السموت سے لاتخلف المیعاد تک سورہ آل عمران کے آخری رکوع کی آیتیں تلاوت فرمائیں۔ (خصائل نبوی، مدارج النبوۃ)

حضرت اسودؒ فرماتے ہیں میں نے حضرت عائشہؓ سے حضور اقدس کی رات کی نماز یعنی تہجد و وتر کے متعلق دریافت کیا حضور کا کیا معمول تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ حضور اکرمؐ عشاء کی نماز کے بعد رات کے اول حصہ میں استراحت فرماتے تھے اس کے بعد تہجد پڑھتے رہتے تھے یہاں تک کہ آخری شب ہو جاتی تھی تب وتر پڑھتے اس کے بعد اپنے بستر پر تشریف لے آتے۔ اگر رغبت ہوتی تو اپنے اہل کے پاس تشریف لے جاتے۔ پھر صبح کی اذان کے بعد فوراً اٹھ کر غسل کی ضرورت ہوتی تو غسل فرماتے ورنہ وضو فرما کر نماز کے لیے مسجد تشریف لے جاتے۔ (شمائل ترمذی)

(ماخوذ از کتاب اسوہ رسول اکرمؐ مکتبہ الحرمین اردو بازار لاہور)

☆.....☆.....☆

خاص مضمون

صائمہ اسما[1]

حجاب کا رجحان اور پاکستانی عورت

پاکستان میں گزشتہ کئی سالوں سے ۴ستمبر کو یوم حجاب منایا جاتا ہے۔ یہ تحریر اس سرگرمی کا حقائق کی روشنی میں ایک تجزیہ پیش کرتی ہے

یہ نائن الیون کے بعد کے دور تھا۔امریکی ریاست ورجینیا کی ہیمپٹن یونیورسٹی سے وابستہ محقق ڈاکٹر ممتاز احمد نے ۲۰۱۰ میں پاکستان میں مذہبی رجحان کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا کہ پاکستان کے نئے مقبول اسلامی لیڈر اپنا حلقہ اثر ایسے طبقات تک بڑھانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو اس سے پہلے روایتی مذہبی رہنماؤں سے بیگانہ رہتے تھے، خصوصاً متوسط طبقہ اور تعلیم یافتہ خواتین، اور یہ ایسے وقت میں ہوا ہے جبکہ پاکستانی حکومت اور ادارہ جات باقاعدہ طور پر جہاد کی پالیسی سے تائب ہونے کا اعلان کر چکے ہیں (ص۲)۔

اسی طرح کی بات برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی کے شعبہ پالیٹکس اینڈ انٹرنیشنل سٹڈیز سے وابستہ محقق پرویز نذیر (۲۰۱۰) نے بھی لکھی ہے کہ نائن الیون کے بعد آنے والے وقت میں پاکستان کی روایتی اور ماڈرن دونوں طرح کی عورتوں نے اپنی شناخت کو اسلام کی طرف میلان کی شکل میں تیزی سے تبدیل کیا ہے۔ اس تبدیلی کے بارے میں نذیر مزید لکھتے ہیں کہ دینی اور غیر دینی دونوں طرح کے تعلیمی اداروں سے تعلیم پانے والی خواتین عورتوں کے پبلک رول کی بجائے گھریلو زندگی اختیار کرنے کی وکالت کرنے لگی ہیں اور بطور ماں عورت کے کردار کی عظمت بیان کرتی ہیں۔ نیز انہوں نے اسلامی احکام کی پابندی کرنی اور مغربی تصورات اور طرز زندگی پر سوال اٹھانے شروع کر دیے ہیں۔ دونوں محققین نے اپنی رپورٹوں میں خصوصیت کے ساتھ پاکستانی خواتین میں حجاب کے انتہائی تیزی سے بڑھتے ہوئے رجحان کا تذکرہ کیا ہے۔

حجاب کلچر کیوں عام ہو رہا ہے؟

سوال یہ ہے کہ سنہ ۲۰۰۰ ی دہائی میں ایسی کیا تبدیلی آئی کہ حجاب کا رجحان عام ہونا شروع ہو گیا اور عرصہ دس سال میں ہی خواتین میں ایسی نمایاں تبدیلی آئی جس کو بین الاقوامی جائزہ رپورٹوں کا حصہ بنایا جانے لگا۔ کہا جا سکتا ہے کہ ایک محرک ترکی میں ہونے والا واقعہ بنا۔ گلوبل میڈیا کے اس دور میں ایک خطے میں ہونے والے حالات و واقعات کا اثر دیگر خطوں میں لازماً پہنچتا ہے۔ مروہ کوا کی کا حجاب پر ڈٹ جانا اور پھر اس کے موقف کی جیت ہونا۔ اس کے بعد جرمنی میں مروہ شربینی کا دل دہلا دینے والا واقعہ پیش آیا۔

لیکن یہ واقعات لاشعور کی تیاری میں مددگار تو ثابت ہو سکتے تھے مگر براہ راست محرک نہیں کہے جا سکتے کیونکہ اس کے لیے کسی مؤثر مقامی حوالے کی ضرورت تھی جبکہ پاکستان میں پردے پر ایسی جبر کی کوئی صورتحال نہیں تھی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ دینی تعبیرات کے حوالے سے نائن الیون کے بعد پالیسیوں اور بیانیوں کو ایک سواسی درجے پر موڑ دیا گیا تھا۔ کل کے ہیرو آج کے دہشت گرد، کل کے نیک پارسا آج کے مجرم، کل کے دوست آج کے دشمن، کل کے محبّ وطن آج کے ایجنٹ قرار دے دیے گئے تھے۔ قوم کی سائیکی کو سارے حقائق جانتے ہوئے بھی اتنی تیزی سے موڑ دینا آسان نہ تھا۔ یہ پاکستانی قوم کے اجتماعی ضمیر کے لیے ایک بے حد مشکل وقت تھا۔ خصوصاً دہشت گردی کی جنگ جس کو عرف عام میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کے طور پر لیا جا رہا تھا، اس میں امریکہ کے ساتھ صف اول کا اتحادی ہونے کی حیثیت نے بہت سے شکوک وشبہات کو جنم دیا تھا۔ رپورٹیں بتا رہی تھیں کہ یہ فقط فوجی اتحاد نہیں ہے بلکہ پورے کے پورے فکری نظریاتی ڈھانچے کو بدل دینے کی مہم ہے۔ جیسا کہ نائن الیون کے بعد امریکی تھنک ٹینک رینڈ کارپوریشن کی رپورٹ نے تجویز کیا تھا کہ پاکستان میں جدیدیت پسند طبقات کی حمایت کی جائے، جدیدیت پسند لوگوں کے طباعتی اور اشاعتی کام کی مالی سرپرستی

---

[1] پی ایچ ڈی سکالر علوم ابلاغیات جامعہ پنجاب، وزٹنگ سٹوڈنٹ ریسرچر یونیورسٹی آف واریک یو کے، مدیرہ ماہنامہ بتول

کی جائے، تاکہ سیکولرازم اور جدیدیت کو مقابل تہذیب کے طور پر مسلمان نوجوانوں کے لیے پیش کیا جاسکے ، کیونکہ پاکستانی نوجوان (بدلے ہوئے حالات میں) خود کو تنہا اور اجنبی محسوس کر کے بغاوت پر آمادہ ہیں۔ نیز بنیادی نوعیت کی مذہبی تعبیرات میں بنیاد پرستوں اور روایت پسندوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایسے معاملات پر جدیدیت پسندوں کی رائے اور جج منٹس کو وسیع پیمانے پر عوام الناس کے لیے مہیا کیا جائے (شیرل بی نارڈ ۲۰۰۳)۔

انہی خطوط پر جنرل پرویز مشرف نے کئی اقدامات اٹھائے اور صدر بش نے پاکستان کو شرف میزبانی بخشتے ہوئے ان کی پیش رفت کی تعریف بھی کی۔ رینڈ کارپوریشن کی ہدایات کے مطابق بنیاد پرستوں کی بجائے میڈیا پر غیر روایتی جدیدیت پسند لوگ اسلام پر اتھارٹی بنا کر پیش کیے گئے۔ جنرل مشرف کے ڈاکٹرائن روشن خیال اعتدال پسندی کا ہر طرف چرچا ہونے لگا۔ پاکستانی قوم کو سخت تناؤ کے ماحول میں مخلوط میراتھون اور جشن بہاراں کا ہلہ گلہ کرنا سکھایا گیا۔ نذیر نے لکھا ہے کہ امریکی اور مغربی حکومتوں اور تنظیموں کی جانب سے پاکستان میں ایسے ٹیلیویژن ٹاک شوز، ڈراموں اور فلموں کو سپانسر کیا جانے لگا جو سیکیولرازم اور لبرل ڈیموکریسی کی خوبیاں دکھائیں اور مذہب اور روایات کو منفی انداز میں پیش کریں۔

اسلام مخالف فضا کا الٹا اثر

سوال یہ ہے کہ ان تمام حالات میں جبکہ پاکستانی عوام کی مذہبیت ختم کرنے کے لیے خاصا زور لگایا جا رہا تھا، یہ مذہبیت کم از کم خواتین کی حد تک بڑھ کیسے گئی؟ خصوصاً حجاب اختیار کرنا جو ماڈرن رجحانات اور میڈیا کے دیے ہوئے طرز زندگی کی موجودگی میں کسی عورت کے لیے ایک آسان فیصلہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد کی رپورٹ اس کا جواب یہ دیتی ہے کہ وہی میڈیا ٹیکنالوجی جس کا پھیلاؤ نیولبرل معاشی پالیسیوں کا حصہ تھا، اسی نے اسلامی تعلیمات کا آسان حصول عوام کے لیے خصوصاً خواتین کے لیے ممکن بنا دیا۔ اس کے نتیجے میں دینی شعور میں تیزی سے اضافہ ہؤا اور خواتین عملی طور پر اسلام کو سمجھ کر اپنانے کی طرف آنے لگیں۔

ایک اور وجہ جو بنیادی طور پر اسی طرح کی ہے، محقق پرویز نذیر نے بھی بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خواتین میں اس تیزی سے آنے والی تبدیلی کو اسلام کی فطرت میں موجود مسئلہ (problematisation of Islam) سے منسوب کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ امریکی پالیسی اور دہشت گردی کی جنگ بنی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسلام کی فطرت میں موجود یہ مسئلہ جس کی طرف نذیر نے اشارہ کیا ہے، وہی ہے جس کو صفی لکھنوی نے رجزِ مسلم میں یوں بیان کیا ہے کہ:

اس دین کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

اب اس فوری اور مقامی ریفرنس پوائنٹ کو ہم عالمی منظرنامے کے ساتھ جوڑ کر دیکھیں گے۔

حجاب پر عالمی منظرنامہ

اس سلسلے میں ۱۹۹۱ میں ترک پارلیمنٹیرین مروہ کوا کی کا ذکر سب سے پہلے آئے گا۔ ترکی وہ ملک تھا جہاں جنگ عظیم اول کے بعد زبردستی حجاب اتروائے گئے تھے۔ پھر وہی ترکی تھا جہاں ترکیوں کی فطرت نے دوبارہ انگڑائی لی اور ایک خاتون ڈٹ گئی کہ وہ حجاب لے کر پارلیمنٹ میں جائے گی۔ اس کے ڈٹ جانے نے ایک سپارک پیدا کیا اور پھر جسے ٹرکل ڈاؤن ایفیکٹ کہتے ہیں، وہاں اپنی روٹس کی طرف لوٹنے اور اسلامی اقدار کے احیا کا سلسلہ ایسا شروع ہؤا کہ آج تک وہ کسی کے روکے رک نہیں سکا۔ اس وقت پہلی بار دنیا مسلمان خاتون کے ''حقِ حجاب'' سے آشنا ہوئی تھی ورنہ اس سے پہلے تو اس کو روایت اور جبر یا پسماندگی کی علامت بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔ بلکہ نائن الیون کے بعد تو اس علامت کو بہت ہی زور وشور سے پیش کیا جانے لگا جب افغان عورت کی ایک گھڑی گھڑائی تصویر دنیا کو دکھائی گئی کہ وہ کس قدر قید، بے بس اور مجبور ہے۔ مروہ کی جدوجہد نے ایک بالکل دوسری تصویر دنیا کو دکھائی۔ تو حجاب پر یہ دو متوازی دھارے ساتھ ساتھ بہہ رہے تھے۔ ایک کے پیچھے وقت کی سوپر پاور اور اس کا سارا زرخرید میڈیا تھا جسے بڑے بڑے ملٹی نیشنل

کاروباری جائنٹس فنڈ کر رہے تھے، تو دوسری طرف حجاب کو حق قرار دینے کی ایک تنہا عورت کی موومنٹ، جس کی اپنی حکومت بھی اس کی مخالف تھی، وہ دنیا بھر کی مسلمان آبادی میں اپنی حمایت پیدا کر رہی تھی۔

اگر ترکی میں ایسا ہو سکتا تھا تو فرانس تو پھر فرانس تھا۔ ۲۰۰۳ میں فرانس نے سکولوں میں سکارف منع کیا تو ۲۰۰۴ میں لندن میں اسمبلی فار دی پروٹیکشن آف حجاب کے اجلاس میں اس پر احتجاج ہوا۔ اسی میں باحجاب خواتین کے ساتھ اس امتیازی سلوک کے خلاف منظّم کوششوں کا فیصلہ کیا گیا جن میں ایک نمایاں بات ۴ ستمبر کو عالمی یوم حجاب کے طور پر منانا تھی۔ 2007 میں مروہ نے یورپین کورٹ آف جسٹس سے کیس جیتا کہ اس کو بنیادی انسانی حقوق کے تحت حجاب کا حق حاصل ہے۔ نوے ہی کی دہائی کے آغاز میں ہنٹنگٹن کی تھیوری تہذیبوں کا تصادم منظر عام پر آئی تھی جس کے دوررس اور ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہی دنیا میں یہ دو متوازی چلنے والے دھارے شدت اختیار کرتے گئے۔ نائن الیون کے بعد سے مسلمانوں خصوصاً مسلم خواتین کے خلاف یورپ اور امریکہ میں ہیٹ کرائمز بڑھتے گئے، یہاں تک کہ یکم جولائی ۲۰۰۹ کو 31 سالہ حاملہ خاتون مروہ ال شربینی کو جرمنی کی بھری عدالت میں سفاکی سے قتل کر دیا گیا۔

پاکستان میں حجاب ایکٹوازم کی ابتدا

اب ایک طرف تو اندرون خانہ پاکستانی خواتین کے حجاب کی طرف رجحان کی حرکیات تھیں تو ساتھ ہی عالمی حالات کا تناظر اس رجحان کو تقویت دے رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستانی عورتوں کی اب تک کی ''پائیٹی موومنٹ'' کی طرز کا جو دینی رجحان تھا، اور حجاب جس کا ایک نمایاں مظہر تھا، اب اس کے متوازی ایک اور رو چلی اور مسلمان عورت کا حق حجاب ایک جدوجہد (ایکٹوازم) میں ڈھل گیا۔ اس ایکٹوازم میں کون سے عناصر شامل ہیں اس پر ہم تھوڑا بعد میں آتے ہیں۔ پہلے ہم مختصراً یہ دیکھتے ہیں کہ اس ایکٹوازم کی پاکستان میں کیا گنجائش ہے، اور اس کی دلیل آج کے حالات میں کہاں سے آتی ہے۔

جن دنوں پاکستان میں جنرل مشرف کی لبرل اقدار متعارف کروائی جا رہی تھیں، انہی دنوں ۲۰۰۵ کے گیلپ انٹرنیشنل پول نے بتایا کہ مسلم ممالک کی خواتین خود کو ہرگز مظلوم (Oppressed) یا دوسرے درجے کا مقام قبول کرنے پر مجبور نہیں سمجھتیں۔ سروے میں شامل پاکستان سمیت ہر ملک سے بھاری اکثریت میں عورتوں نے یہ بھی اقرار کیا کہ ان کے معاشروں کا بہترین پہلو اپنی اخلاقی اور روحانی اقدار اور مذہبی عقائد سے وابستگی ہے۔

گزشتہ دس سال کے عرصے کا جائزہ لیں تو پیو ۲۰۱۴ کے سروے کے مطابق پاکستان میں ۸۹ فیصد لوگ سمجھتے ہیں کہ خاتون کسی نہ کسی شکل میں ڈھکی ہوئی اور کور ڈ ہو تو زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔ انسان خود کو بناتے سنوارتے ہیں تا کہ خوبصورت لگیں، خاص طور پہ صنف مخالف کی نظر میں۔ اس سروے میں خوبصورت کا لفظ بہت بامعنی ہے اور ایسی خوبصورتی کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں جنسی کشش کی بجائے وقار ہے جو احترام پر ابھارتا ہے۔ یعنی حجاب عورت کو ایسی خوبصورتی دیتا ہے جس کے ساتھ بری نظروں اور برے ارادوں سے بچاؤ ہے۔ ایک حالیہ سوشل میڈیا سروے کے مطابق پاکستان میں ۸۵ فیصد سے زیادہ خواتین حجاب کو کسی نہ کسی شکل میں اختیار کرتی ہیں۔ گیلپ پاکستان کی ۲۰۱۹ کی رپورٹ بتاتی ہے کہ پاکستان کے اسّی فیصد لوگ پسند کرتے ہیں کہ عورت باہر نکلے تو کسی نہ کسی انداز سے خود کو ڈھانپ کر نکلے۔

پاکستان کے یہ زمینی حقائق ایک طرف تو یہ بتاتے ہیں کہ یہاں سیکیولر اور مغرب سے متاثر لبرل ایجنڈوں کا مستقبل کوئی خاص تابناک نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ حجاب کے ایکٹوازم کا بھی سکوپ محدود کر دیتے ہیں۔ پاکستان جیسا ملک جہاں حجاب کا رجحان شعوری یا غیر شعوری طور پر پہلے ہی اتنا زیادہ ہے وہاں حجاب یا حقِ حجاب کا نعرہ لگانے کی کیا گنجائش رہتی ہے؟ ہماری ہر علاقائی ثقافت میں خواتین کا لباس ساتر اور باپردہ ہے۔ شہروں میں خواتین اور نوجوان لڑکیاں بڑی تعداد میں خود کو کسی نہ کسی شکل میں ڈھانپ کر باہر نکلنا پسند کرتی ہیں۔ حجاب کے نئے نئے انداز

متعارف ہونا بے حجابی کی نہیں بلکہ حجاب کے فروغ کی علامت ہے۔

اس صورت میں یہاں ۴ستمبر کو یوم حجاب کے طور پر منانا اس حد تک سمجھ میں آتا ہے کہ یہ بعض مغربی اور اسلامی ممالک میں مسلم خواتین کے حق حجاب پر پابندی اور مسلم خواتین سے ان کے لباس کی بنیاد پر امتیازی رویوں کے خلاف احتجاج بھی ہے، اور ان رویوں کا نشانہ بننے والی خواتین کے ساتھ اظہارِ یک جہتی بھی۔اس سے آگے یوم حجاب کا ایکٹو ازم کیا بتانا چاہتا ہے، اس کے لیے معاملے کو ذرا وسیع تر تناظر میں دیکھنا پڑے گا۔

تہذیبوں کا ٹکراؤ

پاکستان میں یوم حجاب منانے کی ''تُک'' کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ فرانس میں ہیڈ سکارف پر پابندی کے نتیجے میں شروع ہونے والا یہ دن رفتہ رفتہ بڑھ کر عورت کی حیثیت کے معاملے میں اسلام اور مغربی تہذیب کے امتیاز کی علامت بن گیا ہے۔مغربی تہذیب کے بر عکس اسلام عورت کو نمائش کی چیز اور محض مرد کے لیے دل بہلاو سامان نہیں بلکہ ایک مکمل انسان سمجھتا ہے اور اس کو عورت ہونے کی بنا پر استحصال سے بچانے کے لیے اصول وضع کرتا ہے۔ اصول جو کہ سرمایہ دارانہ نظام میں گرفتار دنیا کے لیے، جہاں ہر چیز بکنے کے لیے ہے، بے حد انوکھے ہیں اس لیے دیکھنے والوں کے لیے خود بخود دعوت اور لمحۂ فکریہ بن جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اسلام کے خوف کا شکار لوگ اسلام کے کسی اصول پر عمل کرنے والوں کو دیکھ کر خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔فرانس کے صدر نکولس سارکوزی نے سکولوں میں حجاب پر پابندی لگانے کا یہی جواز دیا تھا کہ یہ اسلام پر عمل کرنے کے لیے دوسروں کو ابھارنے کا باعث بنتا ہے اس لیے ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے، اس سے فرانس کا سیکولرازم خطرے میں پڑتا ہے۔اس بیان سے سیکولرازم کی حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یہ نظام افراد کو بقائے باہمی کی بنیاد پر عمل کی آزادی دینے کا علم بردار ہے، مگر یہ اصول وہاں غائب ہو جاتا ہے جہاں لوگ اسلام کے کسی سچے اصول کو اپنانے کا انتخاب کرلیں، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔لہٰذا بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہنٹنگٹن نے تہذیبوں کے جس ٹکراؤ کا اندیشہ ظاہر کیا ہے وہ اس لحاظ سے درست ہے کہ سیکولرازم اور اسلام اپنی اپنی کُلّیت میں ساتھ نہیں چل سکتے کیونکہ ان کی بنیادیں ہی بالکل فرق ہیں۔سیکولرازم کو کیپیٹلسٹ معیشت پر کوئی اعتراض نہیں جبکہ اسلام اس کو کسی طور قبول نہیں کرتا۔عالمگیریت کے عمل پر بھی الزام ہے کہ اس سے مغربی افکار و طرزِ زندگی کا غلبہ دنیا کے ممالک پر مسلط ہو رہا ہے۔ایک حالیہ تحقیق بتاتی ہے کہ پاکستان میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کے اشتہارات پاکستانی کلچر سے ٹکراتی ہوئی اقدار پیش کر رہے ہیں اور ان اقدار کا ہدف نوجوان طبقہ اور خواتین ہیں، نیز یہ رجحان نائن الیون کے بعد کے دور میں جبکہ ملک میں روشن خیال اعتدال پسندی کا چرچا تھا، زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔

عورت پر عالمی ایجنڈے

مغرب کے اسلام فوبیا اور عالمگیریت کے تسلط کے ساتھ اس معاملے میں ایک اور پہلو اہم ہے۔یو این کمیشن آن سٹیٹس آف ویمن کے تحت عورت تو اس بہبود کا ایک جامع پروگرام بیجنگ پلیٹ فارم فار ایکشن کے نام سے ۱۹۹۵ سے جاری ہے، نیز یو این کا سیڈا (CEDAW) کنونشن موجود ہے۔ان کے تحت تمام یو این ممبر ممالک کو عورت کے بارے میں ان کے ایجنڈے اپنے ہاں لاگو کرنے ضروری ہیں۔اس پروگرام میں کئی مفید نکات ہیں مگر بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو مسلمان عورت کے لیے اسلام کے بنیادی فکر و فلسفہ سے متصادم ہیں۔اس پروگرام پر عمومی طور پر انسان، ترقی پذیر، ایشیائی اور مشرقی ممالک کو تو بہت زیادہ تحفظات رہے ہیں، اور ان کے علاوہ ویٹی کن اور دیگر مذاہب کی تنظیموں نے بھی اس سے ناخوشی کا اظہار کیا ہے، مگر خود جدید مغربی معاشرے میں بھی اس کی مخالفت کی کمی نہیں کیونکہ وقت کے ساتھ یہ مغرب کے ان ''الٹرا لبرل'' گروہوں کی بالادستی میں ہے جن کو خود ان کا اپنا معاشرہ بھی بہت قبولیت نہیں دیتا مگر مخصوص نظریاتی و معاشی مفادات کا پروگرام رکھنے والے ایسے طبقے ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں جن کا اثر و نفوذ مغربی

ممالک کی حکومتوں میں بھی ہے۔ ویسے بھی عورت کی حیثیت ایسا معاملہ ہے جس میں مشرق اور مغرب کے ماحول کا فرق سب سے زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ بیجنگ کے ابتدائی اجلاسوں میں مسلم ممالک خصوصاً مصر، مراکش اور تیونس نے ویٹی کن اور خاندانی نظام کی حامی مغربی این جی اوز کے ساتھ مل کر اس ایجنڈے پر کئی اعتراضات اٹھائے تھے۔ مشرقی معاشروں میں خاندان مضبوط ہے جس میں مرد کو سربراہ کی حیثیت حاصل ہے، لہٰذا یہاں مرد کے تعاون کے بغیر عورتوں کی بہتری کے منصوبے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ نیز فلسطین، کشمیر، شام برما، عراق، بوسنیا کہیں بھی مسلمان خواتین پر مظالم، حق تلفیوں، مذہب کی بنیاد پر مسلمان عورتوں سے امتیازی سلوک جیسے معاملات کو عورت کی بہبود کے اس پروگرام کا حصہ نہیں بنایا گیا۔ گیلپ کی مذکورہ بالا رپورٹ (۲۰۰۵) پر ان کی تجزیہ نگار کا کہنا ہے کہ مشرق میں عورتوں کی تقویت خطے میں امریکہ کے اہم مقاصد میں سے ہے، لیکن اس بارے میں کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر ہی کہ دراصل مسلمان عورتیں چاہتی کیا ہیں، محض دلچسپی کی بنا پر سرگرمی ہے۔ عورت کی حیثیت کے اسلام اور اسلامی دنیا کے مسائل سے مختلف تعین کی وجہ سے یہ پروگرام مسلمان عورتوں کے حقیقی مسائل کو مخاطب کرنے میں بڑی حد تک ناکام کہا جا سکتا ہے۔ وہ عورت جس کا مسئلہ ہر بات میں مرد کی برابری نہیں بلکہ مرد کا روزگار ہے تا کہ وہ اپنے کنبے کی کفالت کر سکے، اور جس کو بطور سیکس ورکر اپنے حقوق نہیں منوانے بلکہ بطور ماں بہن بیوی اور بیٹی کے معاشرے میں باعزت مقام کی طلب ہے، اس کے لیے شاید اس پروگرام میں کوئی کشش نہیں ہے۔ جس کو گھر سے نکلنے والے پیاروں کی سلامتی کے لیے امن کا ماحول چاہئے، استعمار کی مسلط کردہ جنگیں اور فساد نہیں۔ جو صنفی فرق کی بنا پر حقوق و فرائض اور دائرہ کار کی تقسیم پر مطمئن ہے، مرد بن کر اپنا سٹیٹس بلند نہیں کرنا چاہتی۔ اگر اسلام کے دیے ہوئے حق تعلیم، حق وراثت اور حق ملکیت سے ہماری عورت ابھی تک محروم چلی آ رہی ہے تو ابارشن کا حق لے کر وہ کیا کرے گی؟ یا اگر غربت دور کرنے کے لیے ملازمتوں میں اس کے برابر کوٹے رکھ بھی دیے جائیں تو کیا یہ مردوں میں احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے سے زیادہ بہتر حل ہے؟ کیا طوائف کو سیکس ورکر کہہ دینے سے اس کی یہ بے حرمتی، مجبوری اور حق تلفی امپاورمنٹ میں بدل جاتی ہے؟ کیا عورت کو مضبوط کرنے کے لیے اپنے خاندان سے اس کے تعلق کو کمزور کرنا ضروری ہے؟ پیراڈائم کے اس فرق نے مسلمان عورت کے حجاب کو ایک ایسی علامت بنا دیا ہے جو ویمن امپاورمنٹ کے ان بین الاقوامی ایجنڈوں کے بالمقابل اپنے پورے قد سے کھڑا ہے۔ گویا یہ محض خود کو ڈھانپنے کا مسئلہ نہیں بلکہ مسلمان عورت کی معاشرے میں حیثیت، کردار اور حقوق و فرائض کے بارے میں ایک counter narrative کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

اس پورے پیراڈائم کے آگے مزاحمت کی علامت کے طور پر یوم حجاب کی اہمیت کو دیکھا جائے تو فطری طور پر پاکستان میں اس کی روح رواں وہ قوتیں ہیں جو ملک میں سیاسی اسلام یا اسلام ازم کے نظریے پر یقین رکھتی ہیں اور عالم اسلام سے مربوط بھی ہیں۔ اور ان میں سرفہرست جماعت اسلامی ہے، جس کا ذیلی خواتین ایک خودمختار تنظیم کے طور پہ دستور کے تحت منظم ہے۔ قاضی حسین احمد ایک وسیع وژن رکھنے والے امیر تھے جو صرف جماعت اسلامی ہی کے نہیں، عالم اسلام کی اسلامی تحریکوں کے مجموعی لیڈر بن کر ابھرے تھے۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے ویمن اینڈ فیملی کمیشن نے ۲۰۰۵ء میں اس وقت سینیٹر ڈاکٹر کوثر فردوس کی سربراہی میں اس دن کو پاکستان میں منانے کا آغاز کیا جسے گزشتہ پندرہ سالوں سے تسلسل کے ساتھ جاری رکھا گیا ہے یہاں تک کہ اب یہ ایک نمایاں سرگرمی کی صورت معاشرے میں معروف ہے۔

سوال یہ ہے کہ حجاب کے اس ایکٹوازم کا پورا فلسفہ سمجھنے والے عوام الناس میں کتنے فیصد ہیں؟ جماعت اسلامی جو صرف ڈاکٹر اسرار صاحب کی تنظیم کی طرح یا تبلیغی جماعت کی طرح ایک اصلاح معاشرہ ہی

کی تنظیم نہیں ہے بلکہ سیاسی جدوجہد میں بھی یقین رکھتی ہے۔ مگر ساتھ ہی دینی جماعت ہونے کے ناطے پردے پر ایک سخت موقف بھی رکھتی ہے جبکہ عالم اسلام میں اس پر کئی قسم کی آرا پائی جاتی ہیں۔ قاضی حسین احمد نے عوام سے مربوط ہونے اور جماعت اسلامی کے اندازِ سیاست کو تبدیل کرنے کے لیے اپنے تئیں بہت سی اصلاحات کیں۔ ان کا مقصد بہت واضح تھا کہ اکیسویں صدی کے عالمی منظرنامے میں پاکستان کے لیے امت مسلمہ سے مربوط وژن ہو کیونکہ یہ ملک قائم ہی اسلام کے نام پر ہوا ہے، اور اس وژن کو جمہوری جدوجہد اور عوامی حمایت کے ذریعے ملک کا مجموعی وژن بنایا جائے۔ یہ ایک گلوبل سوچ پر مبنی لوکل سٹرٹیجی تھی۔ انہوں نے inclusion کے تصور پر مبنی بہت سی پالیسیاں بنائیں تا کہ ان کے بین الاقوامی وژن کا عوام میں نفوذ ہو، لوگ جماعت اسلامی کے وژن کو سمجھیں، اس کے قائل ہوں اور اس کو سیاسی کامیابی سے ہمکنار کریں۔ قاضی صاحب کا حجاب اور پردے پر موقف بھی ان کے مجموعی وژن سے ہم آہنگ تھا جس پر انہیں جماعت کے اندر تنقید بھی سننا پڑتی تھی۔ ان کے بعد یوں لگتا ہے کہ وہ پالیسیاں اپنی مادی شکل تو برقرار رہیں مگر جو مجموعی وژن ان کے اندر جان ڈال رہا تھا وہ نہ رہا اس کامیابی کے وژن کے بغیر اب اس یوم حجاب کو منانے کا مقصد کتنا ہی نیک اور اہم کیوں نہ ہو، عوام تک اس کا ابلاغ اس رول ماڈل تک محدود ہو گیا جو خود جماعت اسلامی کی خواتین پردے کے معاملے میں پیش کرتی ہیں اور جو بہت مومنانہ سہی مگر inclusion کی راہ میں بڑی رکاوٹ رہے گا۔

پاکستان میں اسلام ازم کا نظریہ رکھنے والوں کو اپنی عالمگیر سوچ کو سیاسی کامیابی میں ڈھالنے کے لیے اسی لوکل سٹرے ٹیجی کی ضرورت ہے۔ پردہ پاکستانی عورت کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں عورت کا سب سے بڑا مسئلہ غربت ہے، اچھا طرزِ حکمرانی، آسان انصاف، بے روزگاری سے نجات، بدامنی کا خاتمہ، پینے کا صاف پانی، بنیادی صحت، تعلیم ۔ ہمارے بعض دیہی اور پسماندہ علاقوں میں عورت روایتی جکڑ بندیوں کا شکار ہے، اور افسوس کہ ان علاقوں کے وڈیرے ہماری سیاست کے بڑے نام ہیں، لڑکیوں پر تعلیم کے دروازے بند کرنے والے ہماری پارلیمنٹوں کی رونق ہیں، اور ان میں خواتین بھی شامل ہیں۔ ہم نے مذہب کے کردار کو بھی اس ضمن میں بہت نظرانداز کیا ہے جبکہ اسلامی تحریکیں اس معاملے میں بہت جاندار کردار ادا کر سکتی تھیں۔ حکومتی سطح پر اسلام اسلام کا شور بہت مچایا جاتا ہے مگر اسلام کی خوبصورتی سے استفادہ کرنے کے لیے اس کو اجتماعی نظام کا حصہ بنانے پر کوئی پیش رفت نہیں۔ معاشرتی اصلاح کے پروگراموں میں بھی خال خال عورتوں کے احترام اور ان کے حقوق کی ادائیگی کا تذکرہ سننے کو ملتا ہے۔ اچھے بھلے سمجھدار گھرانوں میں اکثر خود عورتوں کے حوالے سے روایتی سوچ پائی جاتی ہے۔ عورتوں کے سٹیٹس کے بارے میں مذہب اور روایت کو خلط ملط کرنا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ عورتوں کو اسلام کے عطا کردہ حقوق دلوانے کو مہماتی انداز میں آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ حجاب کے ایکٹوازم میں شامل عناصر کو مسائل میں گھری ہوئی عام پاکستانی عورت کے دکھوں کا ازالہ کرنا ہے جو مرد کے آگے بھی مظلوم ہے اور معاشرتی رسوم و رواج کے آگے بھی۔ اور اس کے لیے اسلام ازم کے علمبرداروں کو اپنے خول کو توڑ کر معاشرے کی پیچ پہ آنا ہوگا، اپنے پروگرام کو عام فہم بنانا ہوگا۔ اس کے بغیر عوام کے لیے یوم حجاب کی اس سرگرمی کو سمجھنا اس شعر کے مصداق ہوگا:

اُس کو باغ میں جانے نہ دیجو
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

حوالہ جات:

1-Ahmad, M., Reetz, D., & Johnson, T. H. (2010). Who Speaks for Islam?: Muslim Grassroots Leaders and Popular Preachers in South Asia. National Bureau of Asian Research.

2-Nazir, P. (2010). War on Terror in Pakistan and Afghanistan: discursive and political contestations. Critical Studies on Terrorism, 3(1), 63-81. Doi:10.1080/17539151003594236

☆.....☆.....☆

مرے گھر کو بنا دو گھر دوبارہ

مرے ہمدم مری خاطر
بہت مصروف رہتے ہو
(کبھی مغرور لگتے ہو
کبھی مظلوم لگتے ہو)

ہمارے حال کو
خوشحال کرنے کے لیے ہر دم
بہت سا کام کرتے ہو

کبھی راتوں کی بیداری
کبھی صبحوں کی وہ خواری
کبھی کھانا ادھورا ہے
کبھی نیندیں نہیں پوری

کبھی دفتر کو گھر کرنا
کبھی گھر جیسے دفتر ہو

ہر اک لمحے کی بے چینی
کہاں کھوئی وہ رنگینی
وہ لہجہ تھا شگفتہ سا
لبوں پر بھی تبسم تھا

ذرا سی بات پر اب تو
کسی کو ڈانٹ دیتے ہو
کبھی کہنے لگوں میں کچھ
تو جملہ کاٹ دیتے ہو

مجھے اب تم سے ڈر لگنے لگا ہے
یہ ننھا سہم کر چپ سا ہوا ہے
مری بیٹی بھی مرجھا سی گئی ہے
فضا میں گھر کے ویرانی رچی ہے

یہ ننھے پھول اور کلیاں ہیں پیارے
مگر سہمے ہیں لہجوں سے بچارے

یہاں اک ماں بھی رہتی ہیں تمھاری
تمھاری دید کی حسرت کی ماری
کبھی تو آ کر ان کے پاس بیٹھو
بیچاری راہ تکتی ہیں تمھاری

سنو تم چھوڑ دو سب کچھ خدارا
کہ ہم کم میں بھی کر لیں گے گزارا
ذرا سا وقت ہی مانگا ہے تم سے
مرے گھر کو بنا دو گھر دوبارہ

عشرت زاہد

غزل

پھر تمنا نے خود سری کی ہے
اور محبت نے مخبری کی ہے

اُن کی مرقد کے کچھ فقیروں نے
دل کی دنیا میں سروری کی ہے

میل دل سے اتاریے صاحب
یہ روایت پیمبری کی ہے

بادشاہوں کو بھی ملا کیا ہے
حیثیت کیا سکندری کی ہے

ہم جو بس اپنی دُھن میں رہتے ہیں
یہ کرامت قلندری کی ہے

یہ سُرور اور نور کی برسات
کیفیت اب بھی حاضری کی ہے

پھر رمیصا نے اک غزل کہہ دی
گود وحشت کی پھر ہری کی ہے

آمنہ رمیصا زاہدی

غزل

چل دیا بزم سے یوں سر کو جھکائے ہوئے کیوں
اپنی آنکھوں میں کوئی اشک چھپائے ہوئے کیوں

آپ کو صرف شکایات ہیں سوچا بھی ہے کیا
کل جو اپنے تھے وہ سب آج پرائے ہوئے کیوں

ہم ہراک عہد نبھائیں گے، یہ کہنے کے لیے
آئے تو ہیں وہ مگر آنکھیں چرائے ہوئے کیوں

جی نہ سکتے ہوں اگر سر کو اٹھا کر تو کہو
ہم پھریں بوجھ یہ شانوں پہ اٹھائے ہوئے کیوں

چھوڑ جانے کا ترا فیصلہ خود کا ہے تو پھر
تیری آنکھوں میں یہ بادل سے ہیں چھائے ہوئے کیوں

جب نہیں واسطہ واعظ ترا ان گلیوں سے
روز پھرتا ہے وہاں بال بنائے ہوئے کیوں

میری گلیوں میں بھٹکتے ہوئے پھرتے تھے، وہ سب
آج لگتے ہیں مجھے راہ پہ آئے ہوئے کیوں

جب ملے، دکھ ہی ملے ان سے، خدا جانے بھلا
پھر بھی ہیں دل کو مرے سب وہی بھائے ہوئے کیوں

یہ کہانی تو تمہاری تھی، لگے مجھ کو حبیبؔ
سارے دکھ درد کے دن میرے بِتائے ہوئے کیوں

حبیب الرحمٰن

مرے گھر کو بنا دو گھر دوبارہ

مرے ہمدم مری خاطر
بہت مصروف رہتے ہو
(کبھی مغرور لگتے ہو
کبھی مظلوم لگتے ہو)

ہمارے حال کو
خوشحال کرنے کے لیے ہر دم
بہت سا کام کرتے ہو

کبھی راتوں کی بیداری
کبھی صبحوں کی وہ خواری
کبھی کھانا ادھورا ہے
کبھی نیندیں نہیں پوری

کبھی دفتر کو گھر کرنا
کبھی گھر جیسے دفتر ہو

ہر اک لمحے کی بے چینی
کہاں کھوئی وہ رنگینی
وہ لہجہ تھا شگفتہ سا
لبوں پر بھی تبسم تھا

ذرا سی بات پر اب تو
کسی کو ڈانٹ دیتے ہو
کبھی کہنے لگوں میں کچھ
تو جملہ کاٹ دیتے ہو

مجھے اب تم سے ڈر لگنے لگا ہے
یہ ننھا سہم کر چپ سا ہوا ہے
مری بیٹی بھی مرجھا سی گئی ہے
فضا میں گھر کے ویرانی رچی ہے

یہ ننھے پھول اور کلیاں ہیں پیارے
مگر سہمے ہیں لہجوں سے بچارے

یہاں اک ماں بھی رہتی ہیں تمھاری
تمھاری دید کی حسرت کی ماری
کبھی تو آ کر ان کے پاس بیٹھو
بیچاری راہ تکتی ہیں تمھاری

سنو تم چھوڑ دو سب کچھ خدارا
کہ ہم کم میں بھی کر لیں گے گزارا
ذرا سا وقت ہی مانگا ہے تم سے
مرے گھر کو بنا دو گھر دوبارہ

عشرت زاہد

سچی کہانی

ڈاکٹر میمونہ حمزہ

مضطرب روح کو ایک گھر مل گیا

ڈاکٹر کہتا تھا اس کی نفسیاتی الجھنوں کا حل ناچنے گانے میں ہے، مگر اس کے دل کے کسی گوشے میں عرب آبسے تھے، ارضِ فلسطین کے اصل وارث.....اس لڑکی کی کہانی جو اپنے ماحول میں اجنبی ہوگئی تھی۔

پیگی بڑی عجیب بچی تھی، کمزور، لاغر، اور ڈرپوک! ذرا سی اونچی آواز سے گھبرا اٹھتی، مگر بولتی تو اس کے ذہن کی پٹاری سے ایسے ایسے سوال برآمد ہوتے کہ جواب دینے والا انگشت بدنداں رہ جاتا۔ جس نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تو اس کے قدم کمزوری سے بڑھ کر خوف سے لڑکھڑاتے تھے، اور وہ تھامنے والے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر دیتی گویا ساتھ ہی چمٹ جانا چاہتی ہو۔ گھر سے باہر پہلے سکول میں داخلہ لیا تو وہ بچوں کے گروپ میں بھی تنہا تھی جیسے اسے کسی نے بل فائٹ کے اکھاڑے میں اتار دیا ہو۔ وہ سراسیمہ سی رہتی۔ چھ برس کی عمر میں اس کا پہلا کھیل جہاں وہ گھنٹوں کھیل سکتی تھی، ایک کھلونا گھر تھا۔

دس برس میں اس کا پہلا شکوہ گھر کی دیواروں سے ٹکرایا اور سب کو حیران کر گیا، اس کا کہنا تھا کہ ''ہمارے گھر میں روحانیت کی کمی ہے''۔ اس کمی کو نہ تو اس سے چھ برس بڑی بہن نے محسوس کیا تھا نہ اس کے یہودی عقیدہ رکھنے والے والدین نے۔ لیکن اس کے احتجاج نے مکینوں کو سوچنے پر ضرور ابھارا تھا کہ وہ کیا کمی ہے جس سے ان کی لاڈلی کو ادھورے پن کا احساس جاگ گیا ہے، اور وہ کیا کمی ہے جس نے اس کے لڑکپن کو بے چین بنا دیا ہے۔

بارہ برس کی عمر میں اسے دنیا کو دیکھنے کا شوق چرایا۔ وہ دنیا کے مشہور و معروف مقامات کی سیر سے اپنی پیاس نہ بجھانا چاہتی تھی، بلکہ وہ تو مختلف ملکوں کے لوگوں کی بود و باش دیکھنا چاہتی تھی، اور پھر جو ملک اسے پسند آجائے اس میں اپنا گھر بنا لینے کی خواہش اس کے دل میں ایک کونپل کی مانند نشوونما پا رہی تھی۔ وہ مشرق میں عربوں کے پاس جانا چاہتی تھی، ان کے گھروں اور اس میں اسلام کی عملداری دیکھنا اور انہیں کچھ سمجھانا بھی اس کے خوابوں کا ایک حصّہ تھا۔ اگر یہودیوں کے عیسائیوں جیسا بن جانے پر اسے گلہ تھا تو عربوں کے اسلام سے دور ہونے کا شکوہ بھی تھا۔ اس نے پینٹنگز بنانی شروع کیں تو وہ عربوں کے حقیقی کلچر کو نمایاں کر رہی تھیں، ایک خاموش سا پیغام تھا، تمہارے یہی گھر بہت اچھے ہیں، اپنے گھر نہ بدلو۔

اس کی بہن ''بے ٹی'' دور دراز کالج میں گئی تو اسے گھر کے کمرے میں ملکیت کا احساس ہوا، خوشی سے اس کا روم روم جھوم گیا: ''اب یہ بیڈ روم صرف میرا ہے، اور اب میں اسے جتنا مرضی گندا کر سکتی ہوں''۔ اگرچہ ڈیڈی کی ڈانٹ بھی سننا پڑتی ہے۔ اسے فلموں سے دلچسپی تھی نہ ڈراموں سے، وہ زندگی کے حقیقی کرداروں کو سوچتی اور اسی تخیل میں رنگ بھرتی۔ اسی لڑکپن میں اس نے ایک تصوراتی گاؤں کو حقیقی ماڈل میں ڈھالا، اور پندرہ خاندانوں پر مشتمل اسکیمو گاؤں بنانے کی کوشش کی، مگر تکمیل سے پہلے ہی اکتا گئی، تو ممی نے سارا ماڈل غریب بچوں کو کھیلنے کے لیے دے دیا۔

وہ اپنی سہیلی کے ساتھ گھر گھر کھیلتی، اور اس کا پسندیدہ کردار ''عرب انگلش لیڈی'' تھا، جس میں وہ عرب صحرائی سردار بنتی، پھٹی ہوئی چادر اوڑھ کر اونٹ پر سوار ہوتی اور خیمے میں رہتی، جس میں اس کی کئی بیویاں ہوتیں۔

سکول میں انگریزی کلچر اور ادب کا نام ہے جبکہ وہ اپنے اصل سے جڑنا چاہتی ہے، یہودیوں کے اداس چہرے اسے مغموم کرتے ہیں، اور عبرانی شاعر کی نظمیں اس کے اندر غم بکھیر دیتی ہیں، اسے بے عمل یہودیوں سے گلہ ہے، جو جدت کی تلاش میں اپنے دین سے منافقت

برت رہے ہیں، وہ فیصلہ کرتی ہے کہ وہ ایک قدامت پسند یہودی بنے گی۔ وہ نقلی مذہب سے بیزار ہوگئی اور اصل کی تلاش میں نکل آئی۔

اصلی کرداروں کو تلاشا تو عرب کا ہیرو عبدالقادر الجزائری اپنے پورے قد کے ساتھ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا، اور کنانا کا تیرہ برس کا بدو لڑکا، جس نے اللہ کے نام پر ہتھیار اٹھائے تھے۔ اس نے قلم اٹھایا اور خود ایک کہانی لکھنا شروع کی، جس کا ہیرو ایک عرب لڑکا تھا، جس کی ماں خدیجہ تھی اور باپ ملک وہاب!

اس کی یہی سرگرمیاں تھیں کہ بارہ برس کی عمر میں اس کے اپنے معاشرے کے تربیتی ادارے نے سمر کیمپ کے آخر میں اسے سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جانے کی تجویز دی اس بنا پر کہ اس کی رقص میں دلچسپی نہیں ہے۔ والدین اسے ''سوشل گریسز'' میں طاق کرنا چاہتے ہیں، مگر مخالف جنس، اور جسم کی نمائش دونوں ہی سے اسے کوئی رغبت نہیں۔ جوانی کے آغاز ہی میں وہ مخلوط معاشرے کے سوشل دباؤ پر اپنی ذات ہی کے دائرے میں سمٹ گئی، جبکہ ہر کھیل اور سرگرمی میں پارٹنر اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اس نے لائبریری میں پناہ ڈھونڈی۔ وہ اپنے ماحول میں کتنی اجنبی تھی، ہائی سکول کے جوان زندگی کے رنگوں کے دلدادہ تھے، ہر لڑکی جوانی کی حدود میں داخل ہوتے ہی اتنی بدل جاتی کہ وہ حیران رہ جاتی۔ شوخ وچنچل رویے اور ڈیٹس، ڈانسز، پارٹیز اور کپڑے اور فلم سٹارز ٹین ایجرز کی کل کائنات ہیں، اور وہ؟ ''جاز اور پاپ میوزک'' کی بے ہنگم آوازیں اسے بیمار کرنے لگیں۔ وہ سکول کی ٹاپر تو نہیں لیکن بہت سوں سے بہتر ہے، مگر اسی پچاسی فیصد نمبر لے کر بھی اجنبی سی اجنبی ہے۔ اس کی دلچسپی آرٹ میں ہے، وہ فلسطین کے ان عربوں کی پینٹنگز بناتی ہے، جنہیں عرب فلاحین کہا جاتا ہے۔ محنتی اور اپنے اصل سے جڑے ہوئے عرب اس کے دل کے ایک گوشے میں آ بسے ہیں، وہ انہیں ان کی زمین میں آباد دکھاتی ہے، ارضِ فلسطین جس کے وہ جائز وارث ہیں، جو ان کا اصلی گھر ہے۔

اس کے گھر میں اس کے خلاف محاذ کھل جاتا ہے، ممی تو ممی، ڈیڈی بھی ان عربوں کی نفرت میں بھرے ہوئے ہیں، اور جنگِ عظیم میں یہودیوں کی ہزیمت کا الزام مسلمانوں پر ڈال دیتے ہیں، اس پر دباؤ اس وقت تک بڑھایا جاتا ہے جب تک وہ یہودیوں کے رب سے عہد کی تجدید نہیں کر لیتی۔ اس کے اندر سلگنے والی آگ اسے ایک مرتبہ پھر لائبریری کی جانب دھکیل دیتی ہے، اور وہ متعصب یہودیوں کے لٹریچر کو کھنگالتی ہوئی، عرب اور اسلام کے بارے میں اصل کتابوں تک پہنچ جاتی ہے۔ جہاں مسلمانوں کے گھروں کی ثقافت اور ان کے عورتوں اور بیٹیوں سے عمدہ سلوک کی داستانیں اسے تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھا دیتی ہیں۔ بیٹیوں سے محبت اور ان کی چاہت کو وہ تعصب کی عینک اتار کر پڑھتی ہے اور سرشار ہو جاتی ہے۔

ہائی سکول میں انگریزی کی استانی اسے ''نافرمانبردار'' کہہ کر مسلسل فیل کیے دیتی ہے، اور صاف لکھائی کے نمبر ہی تمام رزلٹ پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ اردگرد مغرور اور حسن پرست ساتھی ہیں، ان کے رویوں کی سفاکی ہے کہ ایک سفید فام، موٹا لڑکا اپنے بیڈروم میں لٹک کر اس بنا پر خود کشی کر لیتا ہے کہ اس کے دانوں بھرے چہرے کی وجہ سے کوئی اس سے دوستی نہیں کرتا، اور ایک خستہ حال طالبہ معاشرتی بائیکاٹ کی بنا پر سکول چھوڑ دیتی ہے اور ملازمت اختیار کر لیتی ہے۔ سکول میں کلاس میں طالب علموں کی تقسیم نسل، قومیت اور معاش کی بنیاد پر ہے۔ اور اسی بنیاد پر مختلف مضامین پڑھنے کی اجازت ملتی ہے۔

تعلیم کے انہیں مراحل میں اسے دہریہ استاد ڈاکٹر شوپ بھی ملتا ہے، جو باور کرواتا ہے کہ ''ایک خدا پر یقین رکھنا جلد ہی قدیم زمانے کی توہم پرستی سمجھی جائے گی، اور انسان جلد ہی اس قابل ہو جائیں گے کہ انسانی زندگی کو مصنوعی لیبارٹریوں میں تیار کر سکیں''۔ اور اپنی دہریت ہی کی بنا پر وہ نہ صرف اس کالج سے نکالا جاتا ہے بلکہ کوئی بھی کالج اس کے نظریات کی بنا پر اسے رکھنا گوارا نہیں کرتا اور وہ پاگل ہو جاتا ہے۔

پیگی کا باپ ایک مادہ پرست انسان ہے، اس کا بزنس پھیلتے پھیلتے لندن، روم اور پیرس کی حدود کو چھو رہا ہے، اور اسے بیمار بیٹی کو دیکھنے کی بھی فرصت نہیں۔ وہ گھر بیٹھ کر ہی اسائنمنٹس کرتی ہے، اور اس کے پاس تازہ ہوا کا جھونکا پھر وہی عرب بودوباش کا ناول ہے جسے وہ ایک بار

پھاڑ بھی چکی ہے۔ ہائی سکول میں اس کے گروپ میں ایک عرب لڑکی بھی ہے، جو فلسطین کے موضوع پر گفتگو میں اسرائیل اور امریکہ کے بارے میں کسی اعتراض پر بری طرح ہلا ماری جاتی ہے، اور اسے معذرت پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اور ایسا نہ کرنے پر اس کا معاشرتی بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے۔ وہ بھی ایک تقریب میں فلسطینیوں کے لیے انسانی حقوق کی آواز بلند کرنا چاہتی ہے تو اسے زبردستی خاموش کروا دیا جاتا ہے۔

امریکی معاشرے کی روایت کے مطابق پیگی کو آئندہ تعلیمی مراحل میں باپ کی کفالت کی سہولت حاصل نہیں، اسی لیے وہ اپنے کالج کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے پلاسٹک فیکٹری میں معمولی ملازمت اختیار کر لیتی ہے، جس میں سستانے کو ایک منٹ بھی میسر نہیں، اس پر مستزاد وہ بس کا کرایہ بچانے کے لیے پیدل مارچ بھی کرتی ہے۔ وہ اپنی ساتھی ورکرز سے اپنے باپ کی معاشی حالت بیان نہیں کرتی، مبادا وہ احساسِ کمتری کا شکار ہوں۔

یونیورسٹی میں داخلہ اس کے لیے نئے چیلنجز لے کر آیا، وہ اس مادرِ علمی میں روح کو سیراب کرنے آئی تھی، مگر یہاں ہاؤ ہو بھی ہے، اور رت جگے بھی، کلچر کے نام پر مخلوط ڈانس پارٹیاں بھی! وہ چند روز میں اعصابی مریضہ بن جاتی ہے، کالج انتظامیہ اس کا ہاسٹل سے اخراج کر دیتی ہے، اور وہ دوبارہ اپنے گھر پہنچ جاتی ہے، مگر بے چینی بڑھ جاتی ہے، عارضی سکون کے لیے وہ کبھی آرٹ کی کلاسز جائن کرتی ہے، کبھی یہودی ربیوں کے گروہ میں شامل ہوتی ہے، جو انتہائی سرد مہر اور بداخلاق ہیں، اور عربوں کے ازلی دشمن! وہ بہائی تنظیم میں شمولیت اختیار کرتی ہے تو کبھی فرقہ سامریہ کے پیروکاروں کی جانب بڑھتی ہے، تھکاوٹ اور بے خوابی مزید بڑھ جاتی ہے، اور اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ سمندر کی موجیں جب اسے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہی ہوتی ہیں، اور ماں باہر جاتے ہوئے کچھ منگوانے کا پوچھتی ہے، تو وہ قرآن کا نسخہ منگوا لیتی ہے، یہ فیصلہ بالکل اچانک ہی ہوا ہے، شاید اس وجہ سے کہ اس نے قرآن پر تنقید تو بہت پڑھی تھی مگر کبھی اس کتاب کو نہ دیکھا تھا۔ اور جب وہ اس کے ہاتھ لگا تو وہ ساری رات اس کا مطالعہ کرتی رہی، اور بائبل سے اس کا موازنہ کرتی رہی۔ اس ترجمے نے اسے تھکا کر رکھ دیا، اس کا ترجمہ کرنے والا خود اس کی حقانیت کا قائل نہ تھا، اور یہ ایک متعصب قلم سے لکھا ہوا ترجمہ تھا، ایمان کے احساس سے عاری! پھر اس نے مارماڈوک پکتھال کا ترجمہ قرآن حاصل کر لیا، اور ایک مومن قلم کی سچائی کے بیان نے اس کے دل میں گھر کر لیا۔ اور پھر قرآن اس کا مستقل ساتھی بن گیا، انیس برس کی عمر میں اس کی کو سکون ملنے لگا۔ اس کا دل ایمان سے بھرنے لگا، زندگی کا مقصد اس کے سامنے آشکار ہو رہا تھا، اس نے قرآن سے ''صبر'' کا مفہوم جانا تھا۔

اس کے ممی اور ڈیڈی نے پچھلے تعلیمی ادارے کی رپورٹ پر اسے شدید ذہنی امراض کے ہسپتال میں داخل کروا دیا، جس نے اس ذہنی مریضہ کے علاج کے نام پر والدین سے رقم اینٹھنی شروع کر دی۔ اس کے چنگل سے نکلی تو اگلا ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ کا پیروکار تھا، جس نے تحلیلِ نفسی کے ذریعے سے علاج شروع کر دیا، جس کے نزدیک اس کی بیماری کا سبب سفلی خواہشات کو دبانا اور انہیں تشنہ رکھنا ہے، اور اس کا حل ناچنا، گانا، آرٹ اور جنسی آسودگی پانا ہے۔ پیگی اسے اسلامی عقیدے اور کلچر کی سچائی بتانا چاہتی ہے، جو ڈاکٹر کے خیال میں بے کار موضوع ہے۔

وہ یونیورسٹی سے نکال دی گئی تھی، اس نے مسلمانوں سے اپنے روابط بڑھائے، ان میں نومسلم بھی تھے اور عرب بھی، اور دیگر ممالک کے بھی!

پیگی کے گھر کے در و دیوار اس کے لیے اجنبی ہوتے جا رہے تھے، ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی والدین کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھانا اس کے لیے ممکن نہ رہا تھا، اس کی نیند اڑ چکی تھی۔ والدین اسے پھر نفسیاتی معالج کے پاس لے گئے، جس نے اسے کسی نفسیاتی ادارے میں داخل کروانے کی تجویز دی تھی کیونکہ وہ ''شیزوفرینیا'' کا شکار ہو چکی تھی۔ یہ رپورٹ اس کے لیے اتنی مایوس کن تھی کہ اس نے خودکشی کا ارادہ کیا، مگر حضرت محمد ﷺ کی اس حدیث نے اس کے اٹھتے ہوئے قدم روک دیے کہ: ''جو بھی خودکشی کرے گا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا''۔ اس کیفیت سے نکلنے کے لیے اس نے اس مہربان رب سے دعا کی جو شہ رگ

سے بھی زیادہ قریب ہے۔

معالج کی رپورٹ نے اس کے آزاد شہری ہونے کے حق کو چھین لیا تھا۔اس نے بھاگ کر مسلمانوں کے گروہ کی جانب رجوع کیا، جنہوں نے اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا، چند گھنٹے ان کے ساتھ گزار کر وہ کافی بہتر محسوس کرنے لگی،لیکن اپنے گھر کی اجنبی فضا میں اخبار کی ایک چھوٹی سی خبر پڑھ کر وہ بے چین ہوگئی۔اسرائیل نے قبضے کے دوران کئی معصوم عورتوں، بچوں اور پرامن شہریوں کو تہہ تیغ کر ڈالا تھا۔والدین کو خبر کا سنانا گویا آسمان کا پھٹ جانا تھا، ان کی بیٹی نے ان کی زندگی اجیرن بنا دی تھی۔وہ سیر کے بہانے اسے گاڑی پر گھماتے ہوئے ایک سرخ اینٹوں کی عمارت میں لے آئے، جہاں تشویش ناک ذہنی امراض میں مبتلا افراد داخل کیے جاتے ہیں۔جو بظاہر چند ہفتوں کے لیے لائے جاتے ہیں،مگر شاید کبھی واپس نہ جانے کے لیے۔

پیگی پر جن کاغذات پر دستخط کروائے جاتے ہیں ان کی سچائی کا کیا کہنا:''میں اپنی مرضی سے یہاں داخل ہو رہی ہوں''۔اگر دستخط نہ کروں تو عدالتی کاروائی،اور بھاگنا چاہوں تو پولیس کا تعاقب۔بعد میں وہ ہر ملاقات پر ممی ڈیڈی کی منتیں کرتی ہے کہ اسے یہاں سے نکال لیا جائے،مگر ان کی دلیل ہے کہ وہ یہ سب اس کی محبت اور بہتری میں کر رہے ہیں، اور وہ صحت یاب ہو کر ہی باہر نکلے گی، کسی پر ذہنی مریض ہونے کا الزام لگا دینا کتنا توہین آمیز ہے،اسے پیگی ہی محسوس کر سکتی ہے۔

والدین کے جانے کے بعد وہ اپنے بیمار رویے کا جائزہ لیتی ہے، تو وہ دراصل اسلام کی حمایت ہے۔اور اسی جرم میں یہ قید بھگت رہی ہے۔ اس کا والد بھیگی آنکھوں سے اسے باور کروا دیتا ہے کہ اب وہ ان کے ساتھ کبھی ایک گھر میں نہ رہ سکے گی۔اور پھر اس کا غم غلط کرنے کو اسے ایک تحفہ ملتا ہے،اس قید خانے میں قرآن کا نسخہ اس کی عرب سہیلی نے بھجوایا ہے، جہاں گھنٹے دنوں کے برابر اور دن ہفتوں کے برابر اور ہفتے مہینوں کی مسافت لیے ہوتے ہیں۔یہاں کبھی اسے برف کی سلوں پر بارہ سے پندرہ گھنٹے تک لٹایا جاتا ہے اور کبھی بجلی کے جھٹکے لگانا بھی علاج کا حصّہ ہے اگرچہ اس کی نوبت نہیں آئی۔اس قید میں مریضوں کے خطوط تک سنسر ہوتے ہیں۔انتظامیہ سے اچھے برتاؤ اور کچن کے کاموں میں مدد اور صفائی کی خدمات ادا کرنے پر اسے سہولتیں ملتی ہیں۔لیکن اتنی مشقت کے بعد بھی اچھا گریڈ ملنے کے بجائے اسے مستقل مریضوں کے حصّے میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں پچاس پچاس برس سے مقیم مریض ہیں۔ایسٹر کے موقع پر اسے بطورِ امتحان ایک ماہ کے لیے گھر بھیجنے کی رعایت ملتی ہے۔اب کے پیگی پورا مہینہ اپنے گھر میں سینت سینت کر قدم رکھتی ہے مبادا کوئی حادثہ اسے پھر مینٹل ہاسپٹل نہ پہنچا دے۔اور والدین کی گواہی پر کہ اب وہ بہتر ہے اسے ہسپتال سے نجات مل جاتی ہے۔

وہ واشنگٹن چلی جاتی ہے جہاں اسے نوکری تو نہیں ملتی، ہاں اسلام کے متعلق سوالات کے جوابات معلوم کرنے کی سعی بڑھ جاتی ہے۔ وہ ٹائپنگ سیکھتی ہے مگر مطلوبہ مہارت حاصل نہیں کر پاتی کہ اس بنیاد پر ملازمت حاصل کر لے، البتہ اسی ہنر کو مختلف موضوعات پر لکھنے میں لگا دیتی ہے۔اس کے مضامین مختلف اخبارات و جرائد میں چھپنے لگتے ہیں، والد خبر پا کر خوش ہوتے ہیں، کیونکہ یہ معاوضے کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

اس کے نہ صرف مسلمانوں سے روابط استوار ہو رہے ہیں بلکہ دین سیکھنے کا عمل بھی تیزی سے جاری ہے،مختلف علماء کرام سے رابطہ کرتے ہوئے وہ سب سے مخلص شخصیت سید مودودیؒ کو پاتی ہے جو اسے اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔دوسری جانب راستے مسدود ہیں، اس کے والدین اسے بتا چکے ہیں کہ وہ اپنی علیحدہ رہائش کا بندوبست کر لے، کیونکہ رہن سہن اور سوچ کا فرق انہیں ایک مکان میں بھی رہنے نہ دے گا۔

اپنے گھر سے بے گھری کے بعد وہ کچھ عرصہ ہاسٹل میں قیام کرتی ہے، اور بالآخر اپنے اسلام کا اعلان کر دیتی ہے۔شیخ داؤد احمد فیصل اسے کلمہ پڑھاتے ہیں اور مریم جمیلہ کا نام تجویز کرتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ سے خط و کتابت جاری ہے، اور جس بات نے مریم کو ہجرت کے فیصلے تک پہنچا دیا ہے وہ اس کے سوا کیا ہے کہ مولانا نے اسے اپنے گھر اور اپنے خاندان کا ممبر بنا کر رکھنے کی یقین دہانی کروائی ہے، جو مکان کی دیواریں نہیں ایک گھر کا تصور ہے۔

اپنے پیش رو نومسلم محمد اسد کا اسلام قبول کرنے کو گھر واپس آنا قرار دینا اس کے دل میں کھب کر رہ گیا ہے۔ کیا یہ مراجعت نہ تھی؟ روح کی مراجعت جو ہزاروں سال پیچھے مڑ کر بھی اپنے گھر کی تلاش میں مصروف رہی، اور جب اسے پالیا تو اسے ایسا لگا جیسے اس کا آسمان کسی بھی دوسرے آسمان سے بڑھ کر گہری رنگت والا، بلند اور ستاروں بھرا ہے۔ جس کے ستارے تاریک رات کے مسافروں کو بھٹکنے سے بچا کر سیدھی اور صاف شاہراہ کا پتا بتاتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا سے روشناس کرواتے ہیں جو تن ہی نہیں، من کو سیراب کرنے والی بھی ہے۔ جو فی الحقیقت گھر ہے، مکان اور گھر کے ہر معنی کو پوری طرح واضح کرنے والی!

☆☆☆

آمنہ رمیصا زاہدی

تری وادی وادی گھوموں

ویسے تو پاکستان کے ہر خطے کی اپنی شان ہے لیکن بلوچستان کا حسن سب سے جدا ہے۔ کراچی کی انتہائی مصروف زندگی جب سانس لینے کی مہلت دیتی ہے تو ہم بلوچستان گھومنے چلے جاتے ہیں۔ تبدیلی کا نعرہ سب کا دل موہ لیتا ہے سو آدھا درجن بچے بھی ساتھ ہو لیتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ وہاں سگنل نہیں آتے، انٹرنیٹ کے بغیر زندگی کے تصور سے سب کو ہول اٹھ رہے ہوتے ہیں مگر سیر کرنے اور نت نئی چیزیں دریافت کرنے کا شوق بہت کچھ کروالیتا ہے۔

کوئٹہ پہنچے تو منے کے ابا پہلے سے وہاں استقبال کو موجود تھے۔ وہ آج کل مانگی ڈیم بلوچستان کے پراجیکٹ مینیجر ہیں اس لیے وہیں پائے جاتے ہیں۔ کوئٹہ سے آگے کچلاک سے ہوتے ہوئے زیارت کراس پر پہنچے جہاں سے ہرنائی روڈ مانگی ڈیم کی طرف جاتی ہے۔ راستے میں ایک جگہ ''چھپر رفٹ'' (Chappar Rift) کا بورڈ لگا نظر آیا جس پر لکھی تفصیلات تو امتداد زمانہ کی نذر ہو چکی تھیں مگر تصویر ہنوز قائم تھی۔ ڈیم کے اندر گیسٹ ہاؤس میں ہماری رہائش کا انتظام تھا۔

جیسے ہی بچوں نے ابا حضور کا یہ جملہ سنا کہ آپ تھک گئے ہوں گے آرام کریں میں ابھی آتا ہوں..... احتجاجی مظاہرہ شروع کر دیا کہ ہم تو آرام کر کر کے تھک گئے ابھی سیر کریں گے۔ بولے مجھے فوراً سائٹ پر پہنچنا ہے وہیں لے چلوں؟ وہاں انگریزوں کے دور کی کچھ تعمیرات ہیں ان کا پوسٹ مارٹم کر لیجیے گا۔ سب تیار ہو گئے۔

انگریزوں نے وہاں پہاڑ کاٹ کر سرنگیں بنائیں اور ریل گاڑی کا راستہ بنایا جس کے ذریعے وہ بلوچستان کا کوئلہ برآمد کیا کرتے تھے۔ وہاں کھدائی میں جو پتھر کے کتبے ملے ہیں ان میں سے ایک پر درج تھا۔ ''پال فلپس، U.S Citizen,1885 یعنی انگلینڈ کے علاوہ امریکا سے بھی لوگ وہاں آئے تھے۔ مقامی لوگ بتاتے ہیں کہ بس چند افسران تھے کچھ کی بیگمات بھی مدفون ہیں۔ اتنی خوبصورت ہیں..... بیگمات نہیں سرنگیں ..... مناسب فاصلے پر ایک ترتیب سے ہوا اور روشنی کے گزر کے لیے راستے بھی بنے ہوئے ہیں کہ اگر ریل گاڑی کہیں رک بھی جائے تو عملہ ہوا کی کمی کا شکار نہ ہو۔ پہاڑ کاٹنے کے لیے اس زمانے میں بارود استعمال کی گئی جس کے نشان جگہ جگہ نظر آ رہے ہیں مگر باقی مشقت دستی ہی کی گئی اور مزدور سارے مقامی لوگ ہی تھے۔ ہمارے انجینئر صاحب نے سرنگ کے ایک حصے کے بارے میں بتایا کہ آج کے دور میں کافی بھاری مشینری کے ساتھ اتنی سرنگ بنانے میں ایک سال لگتا ہے اور اس زمانے میں جب کہ سارا کام ہاتھوں سے پورا کیا جاتا تھا اس حصے کو مکمل کرنے میں کم از کم دس سال لگے ہوں گے۔

ہوا اور روشنی کے انتظام کے لیے جو کھڑکی نما چھوٹی سرنگیں بنائی گئی ہیں وہ کہیں کہیں ایسے راستوں کی طرف کھلتی ہیں جن سے نیچے وادی میں اترا جا سکتا ہے۔ بہت پیاری ندی بہتی نظر آ رہی تھی مگر راستہ بہت خطرناک تھا۔ پانی کی جلترنگ لگ رہا تھا جیسے ہمیں ہی بلا رہی ہے لیکن نیچے جانے کی فرمائش سن کر میاں جی نے دونوں ہاتھ اٹھا لیے اور فرمایا'' واپس لانے کی ذمہ داری ہماری نہیں ہوگی''۔ ہم ذرا نہیں ڈرے تو پھر انہوں نے بتایا کہ نیچے ندی تک جانے اور آنے میں آدھا دن لگ جاتا ہے اور کھانے پینے کا انتظام کر کے جانا پڑتا ہے اس لیے کہ یہ برساتی ندی ہے کبھی کبھی اتنی سلٹ (Silt) ساتھ ہوتی ہے کہ پانی پینے کے قابل نہیں رہتا۔ اس وعدے کے ساتھ واپس ہوئے کہ پھر آئیں گے۔

مہمان خانے میں واپس پہنچے تو بہت تھک چکے تھے ارادہ تھا کہ کھانے اور نماز سے فارغ ہو کر جلدی سو جائیں گے لیکن رات ہوتے ہی

آسمان پر ایسے نظارے دیکھنے کو ملے کہ اللہ کی قدرت پر عش عش کر اٹھے۔آسمان ستاروں سے پٹا پڑا تھا۔ بچے اپنی دوربین سے جوان کی خالہ امریکا سے لائی تھیں کائنات کا مشاہدہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔مختلف برجوں کو پہچان لینے میں کامیابی حاصل ہونے پر خوشی سے نعرے بلند کر رہے تھے۔اتنے زیادہ اور اتنے روشن ستاروں میں برجوں کو علیحدہ سے شناخت کرنا واقعی مشکل تھا۔بارہ شہاب ثاقب (Shooting Stars) تو ہمیں ایک گھنٹے میں نظر آئی پھر نیند کے جھونکے ہمیں کسی اور ہی دنیا کی سیر کرانے لگے۔

اگلے دن نمازِ فجر کے فوراً بعد زیارت کے لیے نکلے۔اس سے پہلے ہم سردیوں میں بھی زیارت کی سیر کر چکے تھے لیکن اس وقت برف کی چادر نے ہر چیز کو سفید رنگ میں رنگ دیا تھا۔سردی کا یہ عالم تھا کہ چھوٹے صاحبزادے کے ہاتھ سے پانی گرا تو گرتے ہی برف بن گیا اور وہ اس پر آئس اسکیٹنگ کے مزے لینے لگے۔گرمیوں میں تو اس علاقے کی سیر کا الگ ہی مزہ تھا۔اور گرمیوں میں یہاں موسم ایسا تھا جیسا کراچی میں دسمبر کے آخری ہفتے میں ہوتا ہے۔آڑو، آلوچے، خوبانی، سیب، انار اور انگور کے باغات اپنی بہار دکھا رہے تھے۔کہیں کہیں چیری کے باغات بھی نظر آئے۔راستے میں ایک جگہ گرما گرم چائے اور گھی میں تر بتر پراٹھوں کا ناشتہ کیا۔لکڑیوں کے چولھے پر بنی سوندھی خوشبو والی چائے پی کر بچپن یاد آ گیا۔آسمان پر کہیں کہیں بادل تھے مگر جیسے جیسے سورج اوپر جا رہا تھا قوس قزح کے رنگ چاروں طرف بکھیر رہا تھا۔

ہم پہاڑوں کے ہی خوبصورت رنگوں کو دیکھ کر حیران تھے کہ اچانک ہماری نظر اپنے بائیں سمت میں تھوڑا نیچے کی طرف پڑی.....ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے قوسِ قزح ہمارے ساتھ ساتھ سڑک پر چل رہی ہے۔کہیں کہیں ہم اس سے اوپر بھی ہو جاتے تھے۔یہ منظر ہمارے لیے بڑا ہی انوکھا تھا۔دھنک تو جب بھی دیکھی اوپر آسمان پر دیکھی تھی مگر یہاں تو لگ رہا تھا زمین پر اتر آئی ہے۔جلدی جلدی کیمرے کی آنکھ میں اس کو محفوظ کرنے کی ناکام کوشش کی۔پھر عوام کے پرزور اصرار پر میاں جی نے گاڑی ایک چھوٹے سے چشمے پہ روک لی جہاں قدرتی مناظر کی عکس بندی کا شوق پورا کیا گیا۔سخت پتھر میں سے نکلتا صاف شفاف پانی اللہ کی قدرت کا منہ بولتا ثبوت پیش کر رہا تھا اور وادی کے حسن کو مزید بڑھا رہا تھا۔اسی طرح مختلف پہاڑی راستوں سے گزر کر ہم زیارت پہنچے۔

زیارت میں صنوبر کے درختوں کے گھنے جنگلات ہیں بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ دنیا میں صنوبر کے درختوں کا دوسرا بڑا جنگل ہے اور یونیسکو کے عالمی ورثے کے مقامات (World Heritage Sites) میں شمار کیا جاتا ہے۔یہاں کے بہت سے درخت پانچ ہزار سے سات ہزار برس پرانے ہیں اس لیے انہیں (living fossils) کا نام دیا گیا ہے۔سردیوں میں یہ برف کی دبیز تہہ سے ڈھکا ہوا تھا اور بہت ہی حسین منظر پیش کر رہا تھا۔مگر شدید برف باری میں گاڑی بلند ترین چوٹی تک نہیں جا سکتی تھی تو ہم آدھے راستے میں رک گئے تھے اور بس تازہ برف میں جامِ شیریں اور کوئس ڈال کر گولے گنڈے بنائے اور کھا کر خوشی خوشی واپس چلے گئے تھے۔

اس دفعہ سب سے پہلے قائدِ اعظم ریزیڈینسی دیکھنے گئے۔رہائش گاہ پر تعینات افسر اور منتظمین نے ہماری بہت اچھی مہمان نوازی کی۔رہائش گاہ کے جن حصوں پر عموماً تالا لگا رہتا ہے وہ بھی کھول کر دکھائے اور عقب میں بنی ہوئی تصاویر کی گیلری کا بھی وزٹ کروایا۔آزادی کی جدوجہد کو مختلف تصویروں کے ذریعے نمایاں کیا گیا تھا اور ساتھ ہی تفصیلات بھی درج تھیں۔تحریک آزادی کے اہم قائدین کے تصویری خاکے ان کی زندگی کے مختصر حالات کے ساتھ آویزاں کیے گئے تھے۔ایک بہت بڑی پینٹنگ ہجرت اور اس دوران ہمارے بزرگوں نے جو قربانیاں دیں اس سے متعلق تھی۔یہ سب دیکھ کر ہمارے چھوٹے بیٹے بولے۔

''اچھا!!!.....تو پہلے پاکستان نہیں تھا تو سب لوگ مسلمانوں کو بہت مارتے تھے، کوئی گھر بھی نہیں تھا اس لیے سب اتنے پیپی ہوتے ہیں 14 اگست کو''۔

قائداعظم کے معالج کا کمرہ دیکھ کر پوچھا یہ کون تھے؟ بتایا کہ یہ قائداعظم کے ڈاکٹر تھے، کہنے لگے ''قائداعظم اتنے بیمار تھے تو ان کو یہاں

کیوں لائے وہ تو راستے میں ہی تھک گئے ہوں گے اور یہاں کوئی ہسپتال بھی نہیں ہے‘‘۔ جب بتایا کہ قائداعظم کو یہاں ہیلی کاپٹر میں لایا گیا تھا تو کچھ مطمئن ہوئے مگر تھوڑی دیر بعد ایک آفیسر سے ہیلی پیڈ کا حدود اربعہ معلوم کرتے نظر آئے۔ اس کے بعد ہم رہائش گاہ کے خوبصورت لان میں چائے اور دیگر لوازمات سے لطف اندوز ہوئے۔

آگے بڑھے تو ایک اونچی چوٹی پر بڑی خوبصورت سیر گاہ بنی ہوئی ہے۔ یہاں ہم پہلے جب آئے تھے تو بڑی زبردست ژالہ باری دیکھنے کو ملی تھی۔ چھوٹے چھوٹے سفید گول گول دانے آسمان سے گر رہے تھے جیسے بچے گھر میں سٹائروفوم (Styrofoam) کو توڑ کر بکھیرتے ہیں اور خوشی سے چیختے جاتے ہیں کہ ہمارے کمرے میں برف باری ہو رہی ہے۔ یہ دانے ہاتھ میں جمع کرنے کی کوشش کرو تو پگھل کر غائب ہو جاتے تھے۔

آج بھی کچھ خنک ہوا چل رہی تھی مگر موسم معتدل تھا۔ یہاں جھولے بھی لگے ہوئے ہیں اور کھانا کھانے کے لیے دائرے کی شکل میں نشستیں لگی ہوئی ہیں جن کے درمیان آگ جلانے کے لیے پتھر کی انگیٹھی بھی بنی ہوئی تھی۔ میاں جی نے ہمارا مافی الضمیر پڑھ لیا اور بولے کہ ہمیں پتہ ہے آگ لگانا آپ کا پسندیدہ کام ہے لیکن ابھی ہمارے پاس بجھانے کا وقت نہیں ہے۔ ہم نے شکوہ کیا کہ آپ نے پچھلی بار بھی یہی کہا تھا تو بولے ابھی ایک دو اور جگہیں دکھانی ہیں آپ کو۔ ان کو پتہ ہے ہمیں آگ لگانے سے بھی زیادہ نئی جگہیں دیکھنے کا شوق ہے۔

یہاں کچھ عجیب وغریب جانور بھی دکھائی دیے۔ صنوبر کے جنگلات بہت سے انوکھے جانداروں کی پناہ گاہ بھی ہیں۔ ایک درخت پر بہت سے ایسے جاندار نظر آئے جو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بچوں کے نانا بابا نے ان کو ایک (bug Collection kit) تحفے میں دی تھی کہ جو انوکھے کیڑے نظر آئیں اس میں جمع کر لینا پھر ان کا مشاہدہ اور تفصیلی مطالعہ کریں گے۔ بچوں نے کمال دکھانے شروع کر دیے۔ وہاں سے آگے بڑھے تو زیارت کے بلند ترین مقام پر پہنچے۔ بلندی انسان کو ہمیشہ اچھی لگتی ہے۔ یہاں ہم سطح سمندر سے ڈھائی ہزار میٹر اوپر تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بادلوں سے بھی اوپر اڑ رہے ہیں۔ نیچے بہت گہری کھائی تھی۔ یہاں موجود کچرے کی مقدار دیکھ کر اندازہ ہوا کہ بہت سے سچے پاکستانی یہاں گھومنے پھرنے آتے ہیں۔

اس سے آگے ڈھلان کا راستہ خرواری بابا کے مزار کو جاتا ہے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ صنوبر کے درخت ان کے پیچھے چلا کرتے تھے۔ ان کی اور بھی بہت سی کرامتیں عوام میں مقبول ہیں۔ بچوں نے پوچھا کیا یہ باتیں واقعی سچ ہو سکتی ہیں جو لوگ بتا رہے ہیں؟ تو ہم نے کہا یہ کرامت ہی کیا کم ہے کہ اللہ نے اپنے ان نیک بندوں کا ذکر خیر صدیوں باقی رکھا اور ان کو سچی ناموری عطا کی۔ اور رہا شرک یا غلو تو وہ تو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام پہ بھی کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے کبھی کسی سے نہیں کہا کہ مجھے بھی خدا بنا لو نعوذ باللہ۔ ڈرتے ڈرتے اندر گئے تو شکر ہے کوئی ایسی چیز نہیں دیکھنی پڑی جو قابل اعتراض ہو۔ فاتحہ پڑھی ان بزرگوں کے ایصال ثواب کے لیے دعا کی پھر مزار سے متصل مسجد میں نماز پڑھ کر واپسی کے لیے روانہ ہوئے۔

راستے میں پھر باغات دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔

ہم سب کا ذوق وشوق دیکھ کر میاں جی نے گاڑی اپنے ایک واقف کار کے باغ میں روکی۔ میزبانوں نے خوب خاطر تواضع کی لیکن جو خوشی اس باغ کے پھل اپنے ہاتھوں سے توڑ کر کھانے میں حاصل ہوئی وہ الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ باغ کے وسط میں پانی کا بہت خوبصورت حوض باغ کے حسن کو چار چاند لگا رہا تھا۔ گلاب کے حسین پھولوں کی بھینی خوشبو نے ماحول کو مست کر رکھا تھا۔ رنگ برنگی تتلیوں کو پریوں کی طرح اڑتے دیکھ کر بے اختیار دل گنگنانے لگا۔

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

وہاں سے نکلنے کا جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن اپنی منزل پر پہنچنا بھی ضروری تھا۔ (جاری ہے) ☆

بند مٹھی میں ریت

''مینا تم آج کل فارغ ہی ہوناں! اگر چھوٹا سا کام کہوں جس کا اجر بے حد وحساب ہے''۔

تنزیلہ بھابھی نے اپنی نند سے کہا۔ جس نے حال ہی میں ایم ایس سی مکمل کی تھی اور اب ایم فل کے لیے پر تول رہی تھی۔

مینا نے ایک لمحہ سوچے بغیر اقرار میں گردن ہلا دی۔ ماں کی وفات کے بعد جس طرح تنزیلہ بھابھی نے اس کا اور اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھا تھا۔ وہ اس کے بدلے میں تو نہیں اس کے اعتراف میں ان کے ہر حکم کی تعمیل کو فرض سمجھتی تھی۔

اس کے فوری اقرار پر تنزیلہ بھابھی مسکرائیں۔

''مینے تم نے کام کی نوعیت بھی نہیں پوچھی؟ کیا پتہ کام مشکل ہی ہو''۔

''مجھے پتہ ہے آپ مجھے وہ کام کہہ ہی نہیں سکتیں جو میرے لیے مشکل ہو''۔ مینا نے جواب دیا۔

''چلو پھر تو شکر ہے..... اب کام کی نوعیت بھی سن لو اگر اوپر والے کو خوش کرنے کے لیے کیا تو درجہ بھی بہت بلند ملے گا۔ سمجھ گئیں؟'' انہوں نے علامتوں کا سہارا لیا لیکن مینا سمجھ گئی تھی۔

''جی ضرور۔ کون ہے؟ کس کلاس کی سٹوڈنٹ ہے؟''

میری دوست کی بیٹی ہے بائیو میں ذرا کمزور ہے اور انگلش تو بے چاری کی ہے ہی خراب، میٹرک میں دو دفعہ دونوں مضامین میں فیل ہو چکی تھی۔ پھر تمام سبجیکٹ بدلے تو بس سمجھو گزارے جوگے نمبروں سے ہی نکلی ہے۔ اب دو چار ماہ کے بعد اس کے فرسٹ ائیر کے امتحانات ہیں مگر انگلش میں بہت پیچھے ہے۔ مالی حالات بس ٹھیک ہیں سلسلہ چل رہا ہے دن رات کا مگر پورے شہر میں صرف لڑکیوں کے لیے کوئی اکیڈمی یا ٹیوشن سنٹر نہیں ہے۔ مخلوط اکیڈمی میں وہ بچی کو بھیجنا نہیں چاہتے۔ اس کا ذہن کوئی بہت اچھا نہیں ہے۔ برا وقت بتا کے تو نہیں آتا، بہر حال احتیاط تو والدین کو ہی کرنا ہوتی ہے۔ بھابھی نے بچی کے لیے ٹیوشن کی ضرورت کا پس منظر بتایا۔

''جیتی رہو''۔

مینا کی رضا مندی کے بعد انہوں نے اپنی دوست سے رابطہ کیا اسی سہ پہر وہ دوست اپنی بیٹی اور کتابوں کے بھاری بھرکم بیگ کے ساتھ حاضر ہو گئیں۔

مینا نے خلوص نیت اور خوش دلی کے ساتھ اسے پڑھانا شروع کیا مگر بہت جلد اسے اندازہ ہوا کہ بچی، جس کا نام فاریہ تھا، کند ذہن، ڈل، ڈفر، نالائقی کے سارے مفہوم پر پورا اترتی تھی۔ پورا گھنٹہ مغز ماری کر کے وہ جو کچھ سمجھاتی، اگلے دن صفا چٹ اور ذہن صاف سلیٹ ہوتا۔ کئی دفعہ مینا کے جی میں آتا کہ ایک تھپڑ لگائے۔ مینا پڑھاتے ہوئے نوٹ کرتی وہ پوری دل جمعی اور یک سوئی سے سن رہی ہے جب اسے سنانے کے لیے کہا جاتا تو وہ مہا ہونق بن کے آنکھیں کھول کے اسے دیکھنے لگتی۔ دو ہفتوں کے بعد مینا نے پڑھانے کا طریقہ بدلہ اور سننے کی بجائے لکھنے پر متوجہ کیا۔ یہ ٹھیک ہے علم سننے اور دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے مگر علم کو محفوظ تو یاد کر کے اور لکھ کے کیا جاتا ہے۔ جب لکھنا پڑا تو شروع میں رزلٹ بہت ہی تکلیف دہ تھا۔ بس پوچھے گئے سوال ہی کو اپنی طرف سے خوبصورت ترین بنا کے لکھا ہوتا تھا۔

مینا کو اس کی نفسیات سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ رٹا پروگرام تھی اور رٹا سسٹم کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ اگر یاد کی چیز کا پہلا لفظ ذہن سے نکل گیا تو باقی کبھی بھی آپ کو یاد نہیں آئے گا۔ اس ناکامی کے بعد مینا نے

طریقہ کار بدلہ اور پڑھائے جانے والے سبق کا کونسپٹ آسان فہم الفاظ میں اس کی کھوپڑی میں منتقل کرتی جہاں پر اسے اب شبہ تھا کہ دماغ نام کی کوئی چیز ہے بھی کہ نہیں!

مینا کی محنت کا اتنا سا رزلٹ سامنے آیا کہ وہ نصابی کتب کے الفاظ کی بجائے اپنے الفاظ میں کچھ نہ کچھ لکھنے لگی۔ زمین جنبد نہ جنبد گل محمد والی فضا بدل گئی تھی۔ مینا کے لیے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ کہنے کو وہ صرف ڈیڑھ گھنٹہ کہ جس کا نصف صرف اور صرف پینتالیس منٹ ہوتے ہیں پڑھاتی تھی مگر مینا اس کے جانے کے بعد دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیتی۔ صبح کو بھگوئے بادام کی گریاں کھاتی..... کبھی کبھار کام والی ماسی کو پچاس کا نوٹ دے کے سر کی خوب مالش کرواتی مگر اپنا دماغ ہی لگتا تھا اب کھوتا دماغ بنتا جا رہا ہے۔ سوچتی خدا خدا کر کے اس کے امتحانات ہوں اور وہ معذرت کر لے۔ ذہنی طور پر وہ تھک جاتی تھی۔ دوسری بات یہ کہ پہلے سے اس کا رزلٹ بہت اچھا تھا۔ پچھلے ماہانہ ٹیسٹ میں اس نے صرف پاس ہو کے نہیں دکھایا تھا بلکہ کلاس کی ابتدائی پچیس لڑکیوں میں اس کا نمبر تھا۔

فاریہ کو پڑھاتے ہوئے اس کو چکر آتے دماغ گھومتا محسوس ہوتا وہ شربت، بادام، ملک شیک بناتی تو ایک گلاس اس کا بھی لانا پڑتا۔ یہ اسے اس کی مرحومہ ماں نے بہت اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ رزق میں حصہ دار کو ڈھونڈنا نہیں پڑتا وہ خود بسا اوقات چل کے دینے والے کے پاس آتا ہے۔ فاریہ ان مہینوں کسی نہ کسی طور بہر حال مینا کے رزق میں حصہ دار ہی رہی۔

پھر فاریہ کی ڈیٹ شیٹ آ گئی۔ ہفتہ بعد اس کا پہلا پیپر ہی انگلش کا تھا۔ مینا اسے پچھلے پانچ سالوں کے سارے تعلیمی بورڈ کے پیپر حل کروا کے دیکھ چکی تھی۔ دونوں کی محنت رنگ لائی تھی۔ مینا کا گرینڈ ٹیسٹ کا رزلٹ نا قابل یقین حد تک شاندار تھا اس نے انگلش میں سو میں سے نوے نمبر لے کے کلاس میں تیسری پوزیشن حاصل کی تھی۔

ان گزرے تین چار ماہ میں واقعی مینا نے خلوص دل سے پڑھایا۔ بھابھی اسے اکثر شاباش دیتیں شکریہ ادا کرتیں لیکن فاریہ نے اس پورے عرصہ میں مجال ہے جو کبھی زبان سے شکریہ کا ایک لفظ کہا ہو۔ کبھی اظہار تشکر کے طور پر آتے ہوئے کوئی چھوٹی موٹی چیز لائی ہو۔ جس علاقے میں فاریہ کا گھر تھا وہاں کی بریانی اور آئس کریم پورے شہر میں سب سے زیادہ مشہور تھی۔ مجال ہے جو کبھی آئس کریم کا ایک سکوپ یا بریانی کی پلیٹ ہی پیک کروا کے لے آتی۔ پڑھانے کا ثواب اجر اپنی جگہ پڑھنے والے کی خصلت بھی تو احسان مندی کی ہونی چاہیے۔ دل ہی دل میں وہ بھابھی کی اس دوست کی بیٹی کو شوہدی، کنجوس جیسے چالیس القابات دے چکی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ اس کا ٹیوشن کا آخری دن بھی طلوع ہو گیا۔ اس نے خود ہی بھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا۔

مینا آپی مجھے آدھ گھنٹہ آنے میں اور آدھ گھنٹہ جانے میں لگتا ہے۔ رکشہ والا بہت پیسے مانگتا ہے، مجھے اللہ کا شکر ہے اب یاد ہو جانا ہے، اب میں ٹیوشن کے لیے نہیں آؤں گی۔ پڑھنے کے دوران وہ بار بار بھیگی آنکھوں کو صاف کرتی رہی لیکن زبان گنگ ہی رہی۔ جاتے ہوئے تنزیلہ بھابھی اور مینا سے وہ خوب لپٹ لپٹ کے ملی۔ آپ دونوں کا شکریہ جیسے الفاظ بھی ادا کیے۔ آج اس کا باپ اسے لینے آیا تھا۔ ایسے ہی مینا کے دل میں آیا اس کی جتنی دوستیں بھی ٹیوشن پڑھانے کا کام کرتی ہیں وہ اکثر بتاتی تھیں کہ اپنی فیس کے علاوہ بھی شاگرد لڑکیاں کچھ نہ کچھ لے کے آیا کرتی تھیں۔ عید پر گفٹ بھی دیتی تھیں۔ اور تو اور خاندانی تقریبات میں مدعو کرتیں، کھانا وانا بھی پیک کروا کے بھیجتیں ایک پتہ نہیں ہماری بھابھی کو یہ مہا کنجوس شاہکار کہاں سے ملا۔

حد ہو گئی حد بے شرمی اور احسان فراموشی کی! ''آپ دونوں کا بے حد شکریہ'' چار ماہ کی ریاضتوں کا بس یہ چار الفاظ میں صلہ۔ اندر تک مینا کلس کے رہ گئی۔ نیکی کر تو لی مگر اب قائم رکھنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ ٹھیک ہے وہ بھوکی نہیں تھی، اسے معاوضے کا لالچ بھی نہیں تھا مگر چار ماہ کی محنت پر کچھ نہ کچھ دینا تو بنتا تھا۔ اس نے کون سا رکھ ہی لینا تھا۔ فیس ہوتی یا تحفہ، وہ واپس کر دیتی مگر شاگرد دیتی تو سہی!

دل اتنا برا ہوا کہ وہ کمرے میں بند ہو گئی۔ موبائل کھولا، سٹیٹس چیک کیے اور کچھ سوچ کے سٹیٹس ٹائپ کرنے لگی۔

''کچھ لوگ بہت بے مروت ہوتے ہیں، احسان ماننا تو درکنار احسان تسلیم ہی نہیں کرتے۔ جیسے ہماری نالائق شاگرد جسے پوری آب وتاب سے پہلے دس نمبروں میں شامل کروایا مگر.....(اس کے بعد کانوں کو ہاتھ لگانے والی اموجیز، ایک دو تین چار.....'')

ایک دولمحہ کچھ سوچا پھر اپ لوڈ کر دیا۔

اسی وقت دروازہ پر دستک ہوئی۔ پھوپھو جانی پھوپھو جانی بابا بلا رہے ہیں۔ مینا کا چار سالہ بھتیجا اس کو بلانے آیا۔ مینا وہاں پہنچی تو بھائی جان بریانی اور آئس کریم کے بڑے بڑے پیک لے کے کھڑے تھے۔

''چلو بھئی مینا شہزادی جلدی سے کھانا لگاؤ''۔

مینا نے جلدی سے برتن دسترخوان پر رکھے۔ بھابھی بھی نماز پڑھ کے آئیں۔ بریانی کھول کر ڈش میں رکھی، آئس کریم فریزر میں رکھتی ہوئی بولیں۔

''تمہاری شاگرد کے والد صاحب دے کے گئے ہیں۔ اور یہ مینا تمہیں فاریہ دے کے گئی ہے کہہ رہی تھی میرے جانے کے بعد دیجیے گا''۔ مینا نے کھانا بھول کے کاغذ کھولا۔

''پیاری مینا آپی! میں آپ کا احسان ساری زندگی نہیں بھول سکتی۔ پاؤں کے نیچے ایک رسنے والے زرے کو آپ نے چمکا کے آسمان کا ستارہ بنا دیا۔ مجھے شکریہ ادا کرتے ہوئے بہت شرم آتی ہے۔ یہ حقیر سا تحفہ ہے اصل تحفہ تو اللہ جی دے سکتے ہیں میں بس روزانہ دو نفل پڑھ کے آپ کے لیے بے پناہ اجر کی دعا کرتی ہوں اور انشاء اللہ مرتے دم تک کرتی رہوں گی۔ ہم مزدور لوگ ہیں رکشہ والا پانچ ہزار مانگتا تھا مہینہ کے میں روزانہ پیدل آتی اور جاتی تھی اس طرح میرے پاس بیس ہزار جمع ہو گئے۔ کچھ میرے پاس جمع شدہ رقم تھی جو عید پر ملی تھی۔ یہ سونے کی انگوٹھی ہمیشہ آپ کو میری نالائقیاں اور اپنی محنت یاد کروائے گی.....امی آپ کو رزلٹ کے بعد تحائف دیں گی۔ میں نے سوچا انعام نتیجے پر نہیں محنت پر دیا جا۔ آپ کی محنت اور محبت کے لیے چھوٹا سا تحفہ قبول کیجیے۔ والسلام، نازیہ''۔

جگ مگ کرتی سبز اور سفید موتی والی سونے کی انگوٹھی کاغذ سے نکل کے اس کی گود میں آ گری تھی۔ اس نے بھاگ کے موبائل اٹھایا۔ اوہ میرے خدایا کہیں فاریہ نے سٹیٹس چیک نہ کر لیا ہو۔

جونہی اس نے سٹیٹس والا آپشن ڈلیٹ کرنے کے لیے کھولا سٹیٹس دیکھنے والوں میں دو منٹ پہلے سب سے اوپر فاریہ رمضان کا نام تھا۔

☆.....☆.....☆

فرحی نعیم

سرپرائز

گھر کے سارے افراد اس وقت بڑے کمرے میں جمع تھے اور سب ہی کے چہرے کسی انجانے جوش سے لبریز تھے۔ ہر کوئی اس آنے والی گھڑی کا بڑی شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ دادی جان ہاتھ میں تسبیح لیے تخت پر بیٹھی حسبِ معمول عصر کے بعد کا وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ تو امی جان دونوں لڑکیوں کو چائے کے ساتھ دو تین لوازمات تیار کرنے کی ہدایت دے رہی تھیں۔ کشور پھپھو وقت گزاری کے لیے میگزین کے صفحے پلٹ رہی تھیں۔ رمنا اور علینہ، امی کی ہدایات سنی ان سنی کر کے آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ ان کا اندازہ، درست ہوگا جب کہ باقیوں کا غلط، اسی طرح ہر کوئی اپنی اپنی جگہ اپنے ہی اندازے کو سو فیصد درست خیال کر رہا تھا۔

''میرے بیٹے کو اس دفعہ بہت بڑی کامیابی ملی ہے۔ میں تو محلے بھر میں مٹھائی بانٹوں گی۔ میرا بیٹا ساری ساری رات جاگ کر پڑھتا تھا۔ آخر اس محنت کا صلہ تو ملنا ہی تھا''۔ امی نے دعاؤں کی کتاب بند کر کے امید سے کہا۔

''اے بہو! بس جانے دو''۔ دادی جان نے پوتے کا تصور کر کے پہلے اس پر پھونکا، پھر اپنے اوپر پھونک ماری، پھر بہو کی طرف متوجہ ہو کر نا پسندیدگی سے گویا ہوئیں۔ ''میں کب سے اپنے بچے کو کہہ رہی تھی کہ میرے پاسپورٹ کی تاریخ ختم ہو چکی ہے، نیا پاسپورٹ بنوا دو، مجھے لگتا ہے کہ میرا پاسپورٹ بن کر آ چکا اور اب میرے لاڈلے نے میرا ویزا ابھی لگوا دیا ہے۔ بس میں اب جلد ہی اس کے ساتھ عمرے کے لیے چلی جاؤں گی، یہی خوشخبری سنانے کے لیے اس نے میرے ساتھ تم لوگوں کو بھی یہاں جمع کر لیا ہے''۔ دادی معصومیت سے کہہ رہی تھیں۔

حارث نے گھر میں سب کو رات کے کھانے پر اکٹھے ہونے کو کہا تھا مگر خود شام سے ہی نہ جانے کہا تھا۔ جواب میں امی نے دل ہی دل میں ان کی سادگی کی داد دی لیکن کشور پھپھو ہمیشہ کی منہ پھٹ، وہ بھائی، بھابھی، بھتیجیوں کی کسی بات کو نظر انداز نہیں کرتی تھیں تو ماں کی انہونی باتوں کو کیسے سن لیتیں۔ فوراً ہی پہلو بدلا۔

''ارے اماں کیسی باتیں کرتی ہیں۔ پاسپورٹ ابھی بن کر سامنے آیا نہیں، آپ پاسپورٹ آفس گئی نہیں اور ویزہ لگ گیا؟ بھائی جان کے کیا سعودیوں سے خصوصی تعلقات ہیں جو اتنی آسانی سے اجازت نامہ مل جائے گا؟ ایسا کچھ نہیں ہے''۔

''ارے کشور، جب بھی بولے گی، دل ہی جلائے گی''۔ دادی نے خفگی سے بیٹی کو دیکھا۔

''تو اماں ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں بلاوجہ امیدیں لگانے سے کیا ہوگا کہ کامیابی کے جھنڈے گاڑے ہیں یا آپ کا حج، عمرے کا بندوبست کیا ہے۔ بلکہ میرے خیال.....''

''کشور، خدا کے لیے تم تو خاموش ہی رہا کرو''۔ امی کو بھی نند کا اپنے اندازے کو ایک جھٹک سے رد کرنا ذرا پسند نہیں آیا۔ اسی لیے اس کی بات پوری ہونے سے پیشتر ہی ناگواری سے بولیں۔

''ارے بھابھی جی، پہلے بات تو پوری سن لیں۔ حارث اگر آپ کا اکلوتا بیٹا ہے تو میرا بھی اکلوتا بھتیجا ہے اور میں تو حق بات کہتی ہوں۔ میں کوئی اس کے خلاف تھوڑی کچھ کہہ رہی ہوں''۔ کشور کے ماتھے پر بل آئے تھے۔

''اچھا تو پھپھو آپ کا کیا خیال ہے، بھائی جو آج ہم سب کو ایک بڑی خوشخبری سنانے بلکہ دکھانے کا کہہ کر گئے ہیں اور اب کسی دم وہ اس خوشخبری کو لیے آئیں گے، تو وہ کیا ہو سکتی ہے؟'' رضا ٹھوڑی کے نیچے ہتھیلی

جماتے ہوئے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''ارے بابا وہی تو بتا رہی ہوں، اچھا چلو! تم کہو، تمہارا کیا خیال ہے تمہارا بھائی کون سا سرپرائز ہم کو دینے والا ہے''۔ کشور نے پہلے بھتیجی کو ہی دعوت دی۔

''میرے خیال سے.....'' رمنا نے سامنے دیوار پر لگی پینٹنگ پر نظر جمائی ''میرے خیال سے تو بھائی کو کسی دوسرے شہر میں کوئی اچھی جاب مل گئی ہے اور اب وہ وہاں جانے والے ہیں''۔

''آئے ہائے رمنا، ایسی بات نہ کرو، میرے اکلوتے بیٹے کو میری ہی نظروں سے دور کر رہی ہو، تم دونوں تو بیاہ کر دوسرے گھر چلی جاؤ گی، میرے گھر کی رونق تو میرے بیٹے کے دم سے ہوگی''۔ امی تو بیٹے کے شہر سے باہر جانے کا سوچ کر ہی دہل گئی تھیں۔

''اور تم کہو علینہ تم کیا سوچے بیٹھی ہو؟'' اب کشور کا رخ چھوٹی بھتیجی کی طرف تھا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ بھائی کا کوئی بانڈ کھل گیا ہے۔ وہ اتنے سارے بانڈ لے کر رکھتے بھی تو ہیں۔ بس اب وہ تھیلا بھر کر نوٹ لے کر آئیں گے۔ میں نے تو ایک لسٹ بھی بنالی اپنی پسندیدہ چیزوں کی، میں تو ساری فرمائشیں پوری کرواؤں گی''۔ میٹرک کی طالبہ علینہ معصومیت سے کہہ رہی تھی۔

''ہمیشہ بے وقوفوں والی بات کرنا'' رمنا جھلائی۔

''تم چھوٹی ہونا تو چھوٹی ہی بات کرتی ہو''۔ پھپھو نے گردن جھٹکی۔

''ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے؟'' علینہ ٹھنکی۔

''اے ہے میں نے تو یہ سنا ہے کہ بانڈ کی آمدنی حلال نہیں''۔ دادی گھبرائیں۔

''ہاں اماں یہی بات ہے، پھر اب کیا کریں گے ہم؟ اتنا لاکھوں روپیہ کہاں رکھیں گے؟

کہاں خرچ کریں گے؟'' امی بھی پریشان ہوئیں۔

''اس رقم سے نہ تو عمرہ ہوسکتا ہے اور نہ.....''

''افوہ اماں! آپ لوگ بھی کہاں پہنچ گئے۔ علینہ تو بچی ہے اور اسی طرح ایک بچپنے کا اظہار کر دیا۔ آپ بھی بس''۔ کشور نے ماں اور بھابھی کی گفتگو میں جھلا کر انٹری دی۔

''بہت ہی ندیدی ہو تم علینہ''۔

''پھپھو.....!!'' علینہ نے احتجاج کیا۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں پھپھو''۔ رمنا نے بھی پھوپھی کا ساتھ دیا۔

''اچھا بس!'' اب کے رمنا کو امی نے گھُرکا تو وہ خاموش ہوگئی۔ کتنی ہی گھڑیاں اسی طرح گزر گئیں۔ سب ہی انتظار کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔

''پھپھو آپ نے بتایا نہیں، بھلا وہ خوشخبری کیا ہوگی؟'' رمنا نے ایک دفعہ پھر کشور کو متوجہ کیا۔

''آں..... ہاں'' کشور نے ہاتھ میں پکڑا رسالہ میز پر اچھالا۔'' کہنے کو تو میں کہے دیتی ہوں لیکن'' وہ چند لمحے رکی'' آپ لوگ تو جانتے ہیں کہ میں حق بات ہی کہتی ہوں''۔

''ہاں جی، خوب جانتے ہیں..... پچیس سال کم نہیں ہوتے'' امی نے کچھ طنزیہ کہا۔

''اے کشور اب کہہ بھی دو اتنی دیر سے پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو''۔ اب کے دادی نے بھی کچھ برا منایا۔

''اماں اس میں کوئی شک نہیں کہ حارث بہت ذہین اور سمجھدار ہے، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس نے جو تعلیم حاصل کی ہے اس کی بھی ہمارے ملک کے اداروں میں بہت مانگ ہے اور یقیناً نتیجہ آتے ہی یا اس سے پہلے ہی بہت اعلیٰ جاب اس کی منتظر ہوگی''۔

''تو پھر تمہیں شک کس میں ہے وہ کہو نا'' امی کچھ بے چینی سے بولیں۔ دیکھیں میں تو ہمیشہ حق بات کہتی ہوں، آج کا زمانہ بہت تیز رفتار ہے، لڑکے، لڑکیاں..... بہت سے فیصلے اب از خود ہی کر لیتے ہیں، اور جس طرح کی یونیورسٹی میں ہمارے بھتیجے صاحب تعلیم حاصل کر رہے تھے وہ بہت ہی ہائی فائی قسم کی تھی۔ لڑکے لڑکیاں بہت کھلے ڈلے ماحول میں

تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پھر ظاہر ہے ایسے ماحول میں جب آزادی بھی میسر ہو تو اپنی زندگی کے فیصلے کرتے دیر نہیں لگاتے''۔ کشور نے لب کاٹے

''کشوررر.....'' امی نے تو دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ ''تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو''۔

امی پریشان ہو گئیں۔

''اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ چاہے کسی کو برا لگے، لیکن کہتی میں حق سچ ہوں''۔

''بس بس کشور''۔ دادی نے ایک نظر بہو کر دیکھا جن کی حالت کشور کی بات سن کر غیر ہو رہی تھی ۔ پھر بیٹی کو گھورا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کو ایسی بات کرنے سے باز رکھا۔

''میرا بچہ بہت فرمانبردار اور تابعدار ہے''۔ دادی نے اپنے لفظوں سے امی کو ڈھارس بندھائی۔

''مجھے معلوم ہے، لیکن ماحول کا اثر بھی ہم جیسوں پر ہی ہوتا ہے۔ وہ لاکھ چہیتا، فرمانبردار سہی لیکن لاڈلا اور آنکھ کا تارا بھی تو ہے، تو پھر اگر.....''

''پھپھو پلیز'' رمنا بھی کشور کا ایسا صاف صاف اظہار سن کر روہانسی ہو گئی تھی''۔ بھائی چار سال پڑھتے رہے ہیں، ایسا کوئی اشارہ بھی نہیں دیا۔ اب اچانک کیسے؟''

''میرا بیٹا کبھی ایسا نہیں کر سکتا کہ کہ.....'' امی سے اس سے آگے نہ بولا گیا۔ کمرے کا ماحول جو کچھ دیر پہلے تک خوشگوار تھا یکدم ہی بدل گیا تھا۔ وہ سب جو خوشی خوشی حارث اور اس کے سرپرائز کا انتظار کر رہے تھے۔ اف فکرمند ہو چکے تھے۔

''پھپھو، آپ ڈرامے بہت دیکھتی ہیں نا، اسی لیے آپ کے ذہن میں یہ خیال آیا''۔ چھوٹی علینہ نے بڑے پتے کی بات کی تھی۔

''تو یہ ڈرامے، فلمیں بھی ہمارے ہی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ کوئی چاند کی مخلوق تو نہیں دکھاتے۔ تمہارے بھائی نے کورٹ میرج کر لی ہے اور وہ یہی سرپرائز دینے کے لیے ہمیں یہاں جمع ہونے کے لیے کہہ گیا ہے''۔

کشور کا لہجہ دوٹوک اور انداز اتنا پر یقین تھا کہ وہ سب لمحہ بھر کو چپ کر گئے تھے۔ کوئی حیران تھا تو کوئی دکھی..... چلو ایسا فیصلہ کرنا ہی تھا تو ہمیں شامل تو کر لیتا..... دل رکھنے کو ہی سہی مشورہ تو کرتا..... ہمیں اتنا ہی غیر سمجھ لیا؟ اور پھر دل سے آہ کی طرح ایک خیال ابھرتا ''ایسا لگتا تو نہیں تھا!''

کمرے کے باقی چاروں نفوس جو کچھ دیر پہلے مختلف اندازے لگا کر خوش تھے اب سب ہی کی سوچ ایک مختلف نکتہ پر مرکوز ہو چکی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی ان کو کشور کی بات ہی کچھ کچھ درست لگ رہی تھی۔

''یا اللہ خیر! کورٹ میرج کیوں کرے گا وہ؟'' امی نے خفگی سے کہا مگر دل دہل کر رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

ہال کمرے میں سب خاموش، ایک دوسرے سے نظریں چرائے گھڑی کی سوئیوں کو دیکھ رہے تھے۔ آج نہ جانے کیوں سوئیوں کی رفتار بھی سست ہو گئی تھی۔ ابھی مغرب میں دیر تھی کہ اطلاعی گھنٹی پر وہ سب چونکے تھے۔

گھر میں کام کرنے والے لڑکے نے دروازہ کھولا تھا۔ حارث کی گاڑی اندر آئی تھی۔ اونچا لمبا حارث گاڑی سے اترا، دوسرا دروازہ کھول کر کوئی اور بھی دروازے سے باہر آیا تھا۔ سب ہی کی نظریں بڑے کمرے کے دروازے پر یقین اور پھر دو نفوس ساتھ ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ امی کے ٹھنڈے ہوتے ہاتھوں کو رمنا نے اپنے ہاتھوں میں تھاما۔

''السلام علیکم! آپ سب لوگ یہاں بیٹھے ہیں؟'' حارث نے کمرے میں داخل ہو کر سب کو سلام کیا اور مسکرا کر سب کو اکھٹے دیکھ کر حیرت سے کہا تھا۔

لیکن اس کے سوال کا تو کیا، سلام کا جواب بھی کوئی نہ دے سکا تھا۔ وجہ وہ لڑکی تھی جو حارث کے پہلو میں کھڑی تھی، ہلکی سی مسکراہٹ جس کے چہرے کو رونق بخش رہی تھی ۔ امی ، دادی ، رمنا اور علینہ سب ہی بغیر پلک جھپکے اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے جو بڑا اچھا لباس پہنے اور کندھے

پر دوپٹہ قرینے سے پھیلائے ہوئے تھی ۔ چاروں کے ذہن میں بیک وقت یہی خیال آیا تھا کہ ان کے اندازے کانچ کے برتن کی طرح ریزہ ریزہ ہو چکے، جب کہ کشور.....کشور کا اندازہ.....!

''امی یہ ماریہ ہے، پچھلے چار سال سے میرے ساتھ ہی پڑھ رہی ہے اور ماریہ یہ میری امی ، یہ دادی، یہ پھپھو اور یہ دونوں بہنیں رمنا اور علینہ''۔ حارث تعارف کی رسم نبھا رہا تھا۔

''السلام علیکم'' ماریہ نے انگریزی لب ولہجہ میں سب کو سلام کیا، لیکن جواب اب بھی ندارد۔

'' تو کیا یہ انگریز ہے اور حارث نے انگریز لڑکی سے ..... اُف!!'' امی سے اس سے زیادہ نہ سوچا گیا۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ان کا دل دھڑکنا بھول جائے گا۔ دوسری طرف کشور وہ واحد تھی جس کے لیے یہ سب غیر متوقع نہ تھا۔ اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے سب سے کہہ رہی ہو۔

'' دیکھا میں نے کیا کہا تھا، میں تو حق بات ہی کرتی ہوں، اب دیکھ لیا نا تم سب نے!''

'' آپ لوگ خاموش کیوں ہیں؟'' اب پریشان ہونے کی باری حارث کی تھی۔

'' حارث یہ لڑکی ؟'' سب سے پہلے امی کے ہونٹوں سے ہی ادھورا جملہ ادا ہوا۔

'' یہ کون ہے؟ کیا غیر ملکی ہے؟'' پھپھو نے امی کا سوال مکمل کیا۔

'' جی یہ کینیڈین ہے، عیسائی مذہب سے تعلق ہے۔ اس کے والدین پہلے یہیں رہتے تھے۔ دو سال پہلے کچھ مسائل ہوئے تو واپس چلے گئے اور یہ تعلیم کی وجہ سے یہیں رہ گئی''۔

''تو اب یہ کہاں رہتی ہے؟'' یہ سوال دادی کی طرف سے آیا تھا۔

''میں ہاسٹل میں رہتی ہوں۔'' ماریہ نے انگریزی لہجہ میں اردو میں کہا۔

''تم اسے یہاں.....'' امی سے اب بھی پورا سوال نہ ہوا۔

''امی جان، میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آج میں آپ لوگوں کو ایک بہت بڑی خوشخبری سناؤں گا، جو میری اب تک کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوگی''۔

'' تو وہ خوشی کیا یہ ہے؟'' دادی نے چبھتی نظروں سے اپنے لاڈلے کو دیکھا۔

''دادی جان، ماریہ بہت سمجھدار اور اچھی لڑکی ہے مغربی ماحول میں رہنے کے باوجود اس کی ساری عادات مشرقی لڑکیوں والی تھیں اور اسی وجہ سے ہماری دوستی ہوئی۔ آج میں اسے آپ سب سے اس لیے ملوانے لایا ہوں کہ ماریہ نے ایک بہت اہم فیصلہ کیا ہے۔ بلکہ اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ، جو اس کی آئندہ زندگی کو بدل کر رکھ دے گا، اور اس فیصلے کے پیچھے کئی مہینوں کی سوچ بچار ہے''۔

'' تو کیا حارث نے اس عیسائی لڑکی سے.....'' امی کی آواز پھر لڑکھڑائی تھی۔

'' اہل کتاب سے تو جائز ہے، اور جس میں اتنی خوبیاں ہوں تو.....'' پھپھو نے ایک بار پھر معنی خیز انداز میں کہا جسے پاس بیٹھی امی اور دادی نے بخوبی سنا تھا اور دادی نے خشمگیں نظروں سے بیٹی کو گھورا۔ حارث اور ماریہ کچھ فاصلے سے سامنے صوفے پر تھے۔ ان تک آواز نہیں پہنچ پائی تھی۔

''جب اس نے اپنے فیصلے سے مجھے آگاہ کیا تو مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی بہت ہوئی پھر میں نے اس کے اس فیصلے میں پورا ساتھ دیا''۔ حارث کہہ رہا تھا اور سب بت بنے اس کی گفتگو سن رہے تھے۔

''تو تم ہم کو بھی اپنے اس فیصلے میں شریک کر لیتے''۔ پھپھو نے کچھ جتلاتے ہوئے کہا۔

''کر تو رہا ہوں''۔ حارث جلدی سے بولا تھا۔

''اب نا''۔ دادی نے بھی خفگی کا اظہار کیا۔ ''پہلے ہی بتا دیتے''۔

''اوہ! اچھا، لیکن بہر حال ماریہ نے جب دل کی پوری رضامندی دے دی تو میں اسے یہاں آپ لوگوں کے پاس لے آیا''۔

''اور اس کے گھر والے؟'' کشور پھپھو کی طرف سے پھر سوال آیا

تھا۔

''وہ ابھی ناراض ہیں، لیکن بہت جلد مان جائیں گے''۔ ماریہ کے لہجہ میں امید تھی۔

''ہاں ان شاء اللہ'' حارث نے محبت بھری نظروں سے ماریہ کو دیکھا۔'' آؤ ماریہ تم دادی جان کے پاس بیٹھو، امی آیئے۔ دادی جان، ماریہ نے بہت سوچ سمجھ کر اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور آج میں اسے آپ کے پاس اسی لیے لایا ہوں کہ آپ دونوں اسے کلمہ پڑھائیں''۔

''کلمہ؟''

''مسلمان ہو رہی ہے؟'' بیک وقت مختلف آوازیں آئی تھیں۔

''حارث تم کیا کہہ رہے ہو؟'' امی متحیر تھیں۔

''امی! ماریہ آج یہاں مسلمان ہونے ہی تو آئی ہے، میں نے تو اس کا اسلامی نام مریم سوچا ہے۔ لیکن آپ دونوں جو بہتر سمجھیں وہ نام رکھ دیجیے گا''۔ حارث مسکرا رہا تھا۔

''اور امی آپ کو ایک اور بہت بڑی خوشخبری سناؤں''۔ وہ چند لمحہ ڈرامائی انداز میں رکا، امی کی دھڑکن تیز ہوئی۔

''ماریہ بلکہ مریم کو میں نے اپنی بہن بنا لیا ہے اور آج سے آپ کی دو نہیں بلکہ تین بیٹیاں ہیں''۔

حارث مگن انداز میں کہہ رہا تھا اور سننے والے ایک بار پھر بری طرح چونک گئے تھے۔ ماتھوں پر آئی واضح اور غیر واضح تیوریاں غائب ہو گئیں تھیں اور اب آنکھیں حیرت کے مارے ابل رہی تھیں۔ حارث کہتا گیا۔

''اس کی فیملی یہاں نہیں ہے۔ بلکہ یہاں اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر آپ لوگ اس کی سرپرستی کریں گے تو اس کے لیے اپنے فیصلے کو نبھانا آسان ہو جائے گا''۔

ماریہ اس دوران دادی کے پاس بیٹھ چکی تھی اور امی.....امی کے سینے سے بھاری بھرکم بوجھ سرک گیا تھا۔ انہوں نے ماریہ کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا تھا اور پھر کشور کو بڑی جتلاتی نظروں سے دیکھا، جیسے کہہ رہی ہوں'' دیکھا، میرے بیٹے کو، میں نا کہتی تھی وہ بہت سمجھدار اور سعادت مند ہے''۔

''آؤ بیٹی میں تمہیں وضو کرا دوں''۔ دادی شہد بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''پھپھو میں نے کہا تھا نا کہ آپ ڈامے اور فلمیں بہت دیکھتی ہیں، آئندہ سے کم دیکھیے گا''۔ علینہ شرارت سے بولی۔ اس کو بھی بڑی دیر بعد اب کھل کر بولنے کا موقع ملا تھا۔

اور کشور.....!! اُسے اب اس کمرے میں اپنی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

فریدہ عظیم

میری امّاں

اُف پھر کوئی چیز مجھ سے آٹکرائی۔

جب چلتی ہوں تو کوئی نہ کوئی چیز میرے راستے میں آجاتی ہے۔ کبھی چارپائی کا پایہ ٹھک کر کے گھٹنے پر لگتا ہے کہ آنکھوں کے آگے تارے ناچ جاتے ہیں۔ کبھی میز بیچ میں آگئی اور کونا گھس گیا۔ کبھی چلتے ہوئے دروازے نے شرارت کی اور ماتھے سے آٹکرایا۔ کبھی سامان نکالتے ڈیپ فریزر کا ڈھکن گر کر دماغ ہلا گیا۔

دنیا کی ان چیزوں نے میرے پورے جسم کو زخمی کر رکھا ہے ابھی بھی ڈاکٹر صاحب پوچھ رہے تھے کہ کیا آپ کے بازو میں کوئی چوٹ لگی تھی جو اتنا درد ہو رہا ہے؟

''پتہ نہیں ڈاکٹر صاحب! یہ گھر کی چیزیں بھی عجیب ہیں.....آ آ کر مجھ سے ٹکرا جاتی ہیں''۔ ڈاکٹر صاحب نے حیران ہو کر ہماری طرف دیکھا۔

''چیزیں ٹکرا جاتی ہیں؟ حیرت ہے''۔ انہیں میری دماغی حالات پر تشویش ہوئی۔ ''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟''

''جی جی بالکل ٹھیک ہے بس ہاتھ میں درد ہے''۔

''اچھا اچھا کچھ کرتے ہیں''۔

میں ایک دم چپ ہوگئی۔ اب ڈاکٹر صاحب ہی مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ گھر والے بھی کہتے ہیں کہ میں ہواؤں سے لڑتی چلتی ہوں۔ میری رفتار سے آس پاس کی چیزیں گر جاتی ہیں اور کچھ تو شہید بھی ہو جاتی ہیں۔ اب اس میں میرا کیا قصور! انہیں خود خیال رکھنا چاہیے کہ میرے راستے میں نہ آئیں۔ پر میری بات کوئی سمجھتا ہی نہیں۔

کچن میں جاؤں تو کوئی نہ کوئی چیز ہاتھوں سے پھسل جاتی ہے اور میری شامت کہ ہاتھوں میں جان نہیں ہے کیا؟ اب کوئی ان برتنوں کا قصور نہیں سمجھتا وہی اچھل کود مچا رہے ہوتے ہیں اور نکلے نکلے پڑتے ہیں۔

بھائی کو گود میں لے کر کھلا رہی تھی کہ ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر پڑا اور جو ہاہا کار مچی۔ اماں کے دو ہتڑ بھی کمر پر لگے۔

''کم بخت کبھی جو کوئی کام ڈھنگ سے کرے..... بچے کا ماتھا پھوڑ دیا''۔

خون تھا کہ بہے جا رہا تھا اور منے کا رونا دھونا میری ننھی سی جان کو ہلا مار رہا تھا۔

''خود گر گیا۔ میں نے جان کر تھوڑی گرایا ہے''۔ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے، منے کے سر پھوٹنے پر بھی اور اپنی کمر کے درد پر بھی۔ اللہ میاں مجھ سے یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ اور تو گھر میں کسی کو بھی لعنت ملامت نہیں پڑتی۔

یوں سمجھیں ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ابا نے حکم دیا تھا کہ یہ بڑی ہوگئی ہے اسے برقع پہناؤ، شتر بے مہار کی طرح گھومتی رہتی ہے۔ اب بھلا ساتویں میں پڑھنے والی بچی برقع پہننے کے لائق ہے؟ مگر ابا کا حکم ہے اور اماں تو فوراً تعمیل کے لیے تیار رہتی ہیں۔ ہفتہ بعد ہمارا برقع تیار تھا اور جب ہم اسکول کے لیے نکلے تو نقاب کبھی منہ پر ڈالتے اور کبھی ہٹا دیتے کیونکہ کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ چلتے چلتے بھینس کے لیے لگے کھونٹے سے ٹکرائے اور گرتے گرتے بچے۔ آنکھوں میں اپنی مظلومیت پر آنسو آ گئے۔ اللہ یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ تانگہ سے اُترنے لگے تو پائیدان میں برقع اٹک گیا۔ تانگہ چل پڑا اور ہم تانگہ کے ساتھ گھسٹتے ہوئے دور تک چلے گئے۔ ہماری چیخ و پکار پر تانگہ رکا تو برقع اچھا خاصا پھٹ چکا تھا۔ سب کے سامنے گرنے کی شرمندگی اور اماں کا خوف الگ۔ ہماری حالت بری ہو رہی تھی۔

ہم سے پہلے ہمارا افسانہ گھر پہنچ چکا تھا۔

''آ گئی نا ہنجار.....کیا بنے گا اس کا.....لڑکیوں والی کوئی نزاکت اور سلیقہ نہیں ہے اس میں''۔

اماں روہانسی ہو رہی تھیں۔اماں کی حالت دیکھ کر ہمیں دکھ ہوا۔

''اماں وہ.....''

''چپ منحوس.....کوئی کام جو ڈھنگ سے کر لے.....سسرال میں جوتے پڑیں گے نا تو چودہ طبق روشن ہو جائیں گے ماں کو بد نام کروائے گی۔میری تو قسمت ہی خراب ہے''۔

اماں دہائیاں دینے لگیں اور ہم سوچ رہے تھے کہ یہاں بھی جوتے اور وہاں بھی جوتے۔کیا لوگوں کو اور کوئی کام نہیں ہے کہ معصوم لوگوں کو جوتے ماریں؟ مار کا سوچ کر ہی دل لرزنے لگا کہ سسرال میں نجانے کون کون ہماری پٹائی کرے گا۔

اماں کو تو جوتے نہیں پڑتے.....نہ ابا مارتے ہیں نا دادی۔شاید اماں بہت اچھی ہیں اس لیے.....میں بھی تو اچھی ہوں سارے کام کرتی ہوں۔بس خود بخود غلط ہو جاتے ہیں۔میں سوچے ہی جا رہی تھی کہ اما[illegible] زوردار دھاڑ سنائی دی۔

''کہاں مر گئی.....اب اُٹھ کر صحن کی جھاڑو دے[illegible] شامت ہونے والی ہے''۔

اور میں بھاگ کر جھاڑو دینے لگی۔مگر یہ کیا جدھر سے جھاڑو دیتی ہوں کچرا ہوا سے پھر وہیں چلا جاتا ہے۔کافی دیر کوشش کے بعد میں اماں کے پاس چلی گئی۔

''دے لی جھاڑو؟''

''نہیں اماں! میں جہاں جہاں سے جھاڑو دیتی ہوں نا، ہوا کچرا دوبارہ وہیں لے جاتی ہے۔ہوا نے مجھ سے ضدم ضدا کی ہوئی ہے''۔

اماں کو میرے ضدم ضدا کہنے پر ہنسی آ گئی۔

''بیوقوف اس رخ کی ہوا ہو گی نا اس لیے کچرا ادھر ہی لوٹ جا رہا ہے۔ٹھہر جا ذرا ہوا تھمے تو پھر دے لینا''۔

اماں کو ترس آ گیا۔

شکر ہے مالک جان چھوٹی ابھی سکھ کا سانس ہی لیا تھا کہ دادی کی آواز آ گئی۔

''آئی دادی! جی کیا کہہ رہی ہیں؟''

''ارے بیٹھ بچی یہ تو بتا تانگہ سے گھسٹنے پر چوٹ تو آئی ہو گی؟''

دادی کا اتنا کہنا تھا کہ میں بلک بلک کر رو پڑی۔

''ساری کہنی چھل گئی ہے کمر پر خراشیں آئیں ہیں''۔

دادی نے محبت سے چپ کرایا آنسو پونچھے۔

''لا میں مرہم لگا دوں اور درد کی گولی بھی کھا اور دو گھڑی میرے پاس آرام کر لے.....ٹھیک ہے چندا؟ اپنی اماں کی بات کا برا مت ماننا وہ سارا دن جھنجھٹوں میں گھری رہتی ہے نا تو تلخ ہو جاتی ہے ورنہ تجھ سے تو وہ بہت پیار کرتی ہے.....کہتی میری عروہ کا کیا بنے گا.....یہ تو بہت معصوم اور سیدھی ہے، بڑی فرمانبردار ہے میری بچی''۔

''سچی دادی؟'' مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اماں مجھ سے اتنا پیار کرتی ہیں۔

اللہ اماں کتنی پیاری ہیں! میں ماں کی محبت میں سرشار ہو گئی۔

''[illegible]دی سارا دن تو ڈانٹتی ہیں''۔

ارے نہیں تیری ہدایت کے لیے ایسا کرتی ہے کہ تو دھیان سے کام کیا کرے ورنہ تُو اس کی جان ہے''۔

''اچھا دادی آپ کہہ رہی ہیں تو ایسا ہی ہو گا.....دادی! کیا آپ کی اماں بھی ایسی ہی تھیں؟''

''ہاں بچی سب مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں، اپنے بچوں سے بہت پیار کرتی ہیں ان کا بھلا چاہتی ہیں ان کے دکھوں پر تڑپ اٹھتی ہیں۔ تھوڑی تھوڑی سخت بھی ہوتی ہیں تا کہ بچے بگڑ نہ جائیں۔اس لیے غصہ بھی کرتی ہیں''۔

اور میرے دل پر پڑے ڈھیروں غموں کا بوجھ کم ہو گیا۔اماں پر پیار آنے لگا۔کتنی اچھی ہیں میری اماں .....سدا سلامت رہیں ..... ہزاروں سال جئیں، کبھی دکھی نہ ہوں۔میں نے دل ہی دل میں اپنی اماں کے لیے دعا مانگی۔اماں کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''آئی اماں..... یہاں آ..... لے یہ دودھ ہلدی پی لے، تانگہ سے گر کر چوٹ آئی ہوگی نا!'' انہوں نے مجھے قریب کر کے میرا ماتھا چوما۔

میرا خوشی کے مارے پورا جسم لرز رہا تھا اور آنکھیں جل تھل۔

''اماں!'' میں ان کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی ''پیاری اماں پتہ نہیں کیوں مجھ سے غلطیاں ہو جاتی ہیں بہت کوشش کرتی ہوں پھر بھی سب گڑبڑ ہو جاتا ہے.....اب خیال کروں گی کہ کچھ غلط نہ ہو''۔

میں مسلسل رو رہی تھی اور اماں پچکارے جا رہی تھیں۔

''چل چپ ہو جا ورنہ میں بھی رو دوں گی''۔

اور میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں تو پہلے سے ہی آنسوؤں سے بھری ہوئی ہیں۔

کتنی عجیب ہوتی ہیں نا یہ مائیں! جن کا وہ پور محبت سے ہوتا ہے بچوں کی تکلیف پر تڑپ اٹھتی ہیں.....مگر کتنا اچھا ہو کبھی پیار کا اظہار بھی کریں کہ بچے ان سے بدظن نہ ہوں۔ مائیں خصوصاً مائیں!

☆.....☆.....☆

شہلا خضر

انعام

تیز تیز قدم اٹھاتی سعدیہ اسکول کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ باریش چوکیدار لالہ کو حسب عادت سلام کیا اور اسٹاف روم کی جانب چل دی۔ بس اسٹاپ سے اسکول ایک دو میل کے فاصلے پہ ہی تھا پر صبح سویرے سے جاری مسلسل تیز بوندا باندی سے سڑکیں جل تھل ہو چکی تھیں۔ تیز رفتار موٹر کاروں کے چھینٹے اڑاتے پہیوں سے بچتی بچاتی وہ جب اسکول پہنچی تو اچھا خاصا بھیگ چکی تھی۔

اسٹاف روم میں آج غیر معمولی شور اور ہنگامہ سنائی دے رہا تھا۔ مس فوزیہ طارق اپنے شوہر طارق صاحب کے شادی کی سالگرہ کے سلسلے میں دیے گئے تحائف دکھا کر داد وصول کر رہی تھیں۔ تمام کولیگ ان کی شاندار قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔ ان کے شوہر ایک کاروباری آدمی تھے اور بیگم کو دنیا جہاں کے تحائف دلوانا شاید ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اور ایسا کبھی نہ ہوا کہ انہوں نے کچھ دیا ہو اور اگلے دن مس فوزیہ اسٹاف روم میں نمائش نہ سجائیں۔ سب کا ماننا تھا کہ وہ ایک قابل رشک زندگی گزار رہی تھیں۔

سعدیہ نے بھی انہیں مبارک باد دی اور اپنی کرسی کی جانب چل دی۔ بیگ اور چادر کرسی پر لٹکا دیا۔ بیشتر اسٹاف آ چکا تھا۔ اسمبلی شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ کچھ اساتذہ حسب معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ دوسری جانب حال ہی میں بھرتی ہوئی آرٹ کی خوبصورت ٹیچر سماویہ اپنی ہم عمر نوجوان ٹیچرز کے ساتھ خوش گپیوں میں مگن تھی۔ وہ کسی وڈیرے کی بیٹی تھی اور شوقیہ اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ سماویہ کو آئے ابھی ایک ماہ بھی نہ ہوا تھا مگر اس کی خوش مزاجی اور خوش لباسی نے سب کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ جہاں سماویہ موجود ہو وہاں ہر طرف قہقہے ہی گونج رہے ہوتے۔

سب کتنے مگن اور مسرور لگ رہے تھے۔ اسٹاف روم میں یہ وقت سب کے لیے تمام دن کا سب سے بہترین وقت ہوتا تھا اور سب اساتذہ خوب باتیں کرتیں۔ پر سعدیہ کو اب ان سب باتوں سے بالکل دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہر دم گھریلو مسائل اور تفکرات اسے گھیرے رکھتے تھے۔ گھر کا کرایہ، بیٹے کی فیس، شوہر کی دوائیاں، راشن کی لمبی لسٹ اور یوٹیلیٹی بلز کی ادائیگی..... یہ سب کچھ اسے ہی کرنا تھا۔ یہ سوچ کر اسے عجیب طرح کی گھٹن محسوس ہونے لگی۔

وہ اسٹاف روم کے دائیں جانب بنے چھوٹے سے باغیچے میں آ گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ صبح سے جاری پھوار کی وجہ سے سب پھول پودے دھل کر نکھر گئے تھے۔ مٹی کی سوندھی خوشبو اور پھولوں کی مہک نے مل کر ماحول کو بہت دلکش بنا دیا تھا۔ سعدیہ تازہ ہوا میں گہرے سانس لینے لگی۔ وہ اپنے دل و دماغ کے سارے تفکرات سے کچھ لمحوں کے لیے نجات پانا چاہتی تھی۔

آج مس فوزیہ کی تحائف کی نمائش اور ساتھی اساتذہ کے ہنستے مسکراتے چہرے دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے اپنے وجود میں چھپائے کرب اور محرومیوں کے نشتر اور بھی زیادہ چبھنے لگے تھے۔ سعدیہ سدا سے ایسی نہ تھی۔ شادی سے پہلے وہ بھی بہت خوش مزاج ہوا کرتی تھی مگر پے در پے مسائل نے اس پر یاسیت طاری کر دی تھی۔ اس نے ہمیشہ زندگی کی ہر آزمائش کو اللہ کی رضا سمجھ کر صبر سے قبول کیا۔ پر آج نہ جانے کیوں اس کا دل بھر آیا۔ ڈھیروں شکوے اس کی زبان پر آ گئے اور کہنے لگی۔

''اے پاک پروردگار کیا تمام خوشیاں ان امیر لوگوں کے نصیب میں ہی ہیں؟ کیا ہم جیسے لوگوں کی قسمت میں مصائب اور پریشانیوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ لکھ دیا گیا ہے؟ یہ کیسا انصاف ہے تیرا؟ ہم بھی

تو تیری رحمتوں کے مستحق ہیں! تو ہمارے خالی دامن کو خوشیوں سے کیوں نہیں بھر دیتا؟''

وہ شدید کرب اور مایوسی میں مبتلا تھی۔ شاید اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا یا پھر اس کی برداشت کی حد ختم ہو چکی تھی۔

ماضی کی یادیں ایک ایک کر کے قطار در قطار اس کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔

سعدیہ کی شادی کو دس سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔

شادی کے کچھ عرصے بعد اس کے شوہر گردوں کے مرض میں مبتلا ہو گئے جس کے باعث ان کی نوکری بھی چھوٹ گئی۔ ڈاکٹروں کے مطابق ان کا ایک گردہ ناکارہ ہو چکا تھا، لہٰذا وہ زیادہ محنت والا کام نہیں کر سکتے تھے۔ ذریعہ معاش نہ رہا تو سعدیہ نے اپنے زیورات بیچ کر چھوٹی سی پرچون کی دکان کھلوا دی۔ مگر آئے دن بیمار رہنے کی وجہ سے وہ اسے بھی ٹھیک سے چلا نہ پائے، مجبوراً سعدیہ کو گھر کے قریب ایک اسکول میں نوکری کرنی پڑی۔ اللہ نے انہیں ایک بیٹے کی نعمت سے بھی نوازا تھا، سو گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ٹیوشنز کا سہارا بھی لینا پڑا۔

انہی حالات کا سامنا کرتے دس سال بیت گئے۔ اس کے شوہر رفیق صاحب کی بیماری اب ان کی زندگی کا مستقل حصہ تھی۔ رفیق صاحب سعدیہ کی بہت عزت کرتے اور اپنے تئیں بیوی بچے کا ہر طرح سے خیال رکھنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ جب وہ ٹھیک ہوتے تو ضرور دکان پر بیٹھتے تاکہ کچھ نہ کچھ آمدنی آتی رہے۔ مگر رفیق صاحب کی بیماری کی وجہ سے اچانک بدلتے حالات نے ہنستی مسکراتی سعدیہ کے مزاج کو یکسر بدل ڈالا تھا۔ اس کی مسکراہٹ اس سے روٹھ چکی تھی۔ اتنی کم عمری میں کٹھن حالات کا مقابلہ مردانہ وار کرتے کرتے وہ خود کسی چٹان کی طرح ہی ہو چکی تھی، مضبوط پر جذبات سے عاری!

کچھ دیر باغیچے میں اپنے رب سے گلے شکوے کر کے اس کا دل کچھ ہلکا ہو گیا۔ وہ واپس اسٹاف روم کی جانب چل دی۔

مس فوزیہ اسٹاف روم سے کچھ فاصلے پر کھڑی فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر رنج نظر آ رہا تھا۔ فون بند کر کے وہ رونے لگیں۔ سعدیہ کو بہت حیرت ہوئی کہ ایسی کیا بات ہو گئی جو کچھ دیر پہلے ہنستی مسکراتی مس فوزیہ یوں رونے لگیں۔ اس سے رہا نہ گیا اور مس فوزیہ سے پوچھ ڈالا۔

''کیا بات ہے مس فوزیہ خیریت تو ہے آپ کیوں رو رہی ہیں؟''

مس فوزیہ نے شکستہ لہجے میں کہا۔

''سعدیہ یہ آنسو تو میری زندگی کا حصہ ہیں۔ جب شادی ہو کر سسرال گئی تو بھرا پرا کنبہ تھا۔ میرے شوہر سے چھوٹے پانچ بھائی بہن تھے جن کی نگہداشت میں نے ماں کی طرح کی۔ میری ساس بہت نیک عورت ہیں انہوں نے بھی ہمیشہ مجھے بے حد عزت اور محبت دی لیکن شوگر کی دائمی مریضہ ہونے کی وجہ سے وہ اکثر بیمار ہی رہتیں۔ میں نے اپنے دونوں دیوروں اور تین عدد نندوں کی شادیاں اپنے ہاتھوں سے کروائیں۔ شادی کے پندرہ سال بعد بھی اپنے شوہر کو جب اولاد کی خوشی نہ دے پائی تو انہوں نے دوسری شادی کر لی''۔ فوزیہ نے ٹھنڈا سانس بھرا، آنسو صاف کیے اور پھر گویا ہوئی۔

''میں نے اسے اپنا نصیب سمجھ کر خوش دلی سے قبول کیا۔ پر جب اللہ نے انہیں اولاد کی نعمت دی تو انہوں نے مجھ سے نظریں پھیر لیں۔ وہ اپنی بیوی کی باتوں میں آ گئے اور ہم سے علیحدہ دوسرا گھر لے کر وہیں اس کے ساتھ رہنے لگے۔ اب وہ ہم سے ملنے بھی کئی ماہ بعد آتے ہیں۔ البتہ خرچے کی بھاری رقم وہ باقاعدگی سے بھجواتے ہیں۔ مگر تم ہی بتاؤ کیا پیسے انسان کا نعم البدل ہو سکتے ہیں؟ میرا پورا سسرال اولاد نہ ہونے کے باوجود بھی آج میرے ساتھ ہے اور میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ ایک نہ ایک دن میرے شوہر کو جب اپنی زیادتیوں کا احساس ہو گا تو وہ ضرور میرے پاس لوٹ کر آئیں گے۔ اسی لیے میں اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے سب کے سامنے آئیڈیل ازدواجی زندگی کی کہانیاں سناتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ ٹھیک نہیں پر مجھے اپنے شوہر کی عزت بہت پیاری ہے، میں ان کے بارے میں دوسروں کے کڑوے الفاظ نہیں سن سکتی۔ مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ اگر میں اس دکھ کی تشہیر کروں گی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آنے والی اس آزمائش میں کہیں ناکام نہ ہو جاؤں اور بے شمار حاصل شدہ

نعمتوں کی ناشکری کی مرتکب نہ ہو جاؤں‘‘۔

سعدیہ ان کی باتیں سن کر چکرا گئی۔ بظاہر اتنی خوش دکھنے والی خاتون درحقیقت دل میں کتنے غم چھپائے ہوئے ہے یہ تو کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔

’’ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی مس سعدیہ‘‘ فوزیہ نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو سعدیہ نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کی۔

اسمبلی کی گھنٹی بج گئی تھی۔ وہ دونوں اسٹاف روم پہنچیں اور دیگر اساتذہ کے ہمراہ ہال کی جانب چل پڑیں۔

سعدیہ حیران تھی کہ اتنے ڈھیروں دکھوں کے باوجود مس فوزیہ سب کے سامنے کتنی پرسکون اور مطمئن رہتی ہیں جبکہ وہ تو خود کو ہمیشہ دنیا کی سب سے دکھی عورت سمجھ کر غم زدہ ہی رہتی۔ اسے کچھ دن پہلے کے اپنے شوہر کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو وہ اپنے کسی دوست سے باتیں کرتے ہوئے کہہ رہے تھے اور سعدیہ نے اتفاقاً سن لیے تھے۔

انہوں نے کہا تھا ’’میرے دوست میں ہر پل اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ سعدیہ جیسی نیک اور سمجھدار بیوی کی رفاقت میرے نصیب میں آئی۔ وہ نہایت صابر عورت ہے، میری بیماری میں اس نے میرے حصے کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا لیا اور کبھی گلہ شکوہ نہ کیا‘‘۔

سعدیہ کے کانوں میں اپنے شوہر کے الفاظ گونج رہے تھے اور وہ دل ہی دل میں کچھ دیر قبل نصیب کے بارے میں آنے والے اپنے منفی خیالات پر شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

’’کتنی سطحی سوچ ہے میری..... مجھے اپنے مصائب ہی بڑے دِکھتے ہیں، اللہ کے کرم پر نظر ہی نہیں جاتی۔ بھلا آزمائشیں نہ ہوں تو انسان اللہ کے انعامات کا احساس کیسے کرے‘‘۔

انہی سوچوں میں گم وہ ہال میں پہنچ گئی۔

آج اسمبلی کے ساتھ ہی اسکول کی سالانہ تقسیم انعامات کی تقریب تھی۔ نتائج کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ اتنے میں پرنسپل نے ایک اہم اعلان کے لیے سب کو متوجہ کیا۔

’’بورڈ کی جانب سے ہر سال اسکول کی سب سے قابل اور محنتی ٹیچر کے لیے‘‘ سال کی بہترین ٹیچر‘‘ کا ایوارڈ مخصوص کیا جاتا ہے۔ اس بار یہ ایوارڈ مس سعدیہ رفیق کو دیا جا رہا ہے۔ ان کو لگاتار تین سال سے بورڈ میں پوزیشن حاصل کرنے والے بچوں کی کلاس ٹیچر ہونے کی وجہ سے اس ایوارڈ کی مستحق قرار دیا گیا ہے‘‘۔

پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اعلان ابھی جاری تھا۔

’’اسکول کے ڈائریکٹرز کی جانب سے مس سعدیہ کے لیے نقد انعام اور پروموشن کا اعلان بھی کیا جاتا ہے‘‘۔

سعدیہ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ پرنسپل سے انعام اور شیلڈ حاصل کر کے وہ ہر طرف سے مبارکبادیں وصول کر رہی تھی۔ ہر کوئی اس کو رشک سے دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ تو جیسے وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہ تھی۔ بے شمار خیالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ اسے ایک بار پھر صبح کے وقت اپنے کہے ہوئے ناشکری کے الفاظ شدت سے یاد آ گئے اور اس کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو بھر گئے۔ دیکھنے والے یہی سمجھے کہ خوشی کے آنسو ہیں۔ وہ انہیں کیا بتاتی کہ آج پہلے دن اسے خود پر اللہ کے انعام کا احساس ہوا ہے، اور یہ خوشی کی بات بھی ہے اور ندامت کی بھی۔ اب وہ ان سب سے رخصت لے کر جلد از جلد گھر جانا چاہتی تھی۔

گھر..... جہاں اس کی قدر کرنے والا شوہر اور پیارا سا بیٹا تھا!

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر فائقہ اویس

سعودی عرب میں رہنے کا تجربہ

موسموں کی رنگا رنگی

کچھ بیاں سعودی عرب کے موسم کا ہو جائے۔ جب تک ہم مملکت سے باہر تھے تو اس کے سب موسموں کو مکہ الشریفہ کے موسموں کی طرح ہی سمجھتے تھے۔ یہی خیال تھا کہ سال کے بارہ مہینے، ہر شہر اور ہر جگہ پر ایسی ہی گرمی پڑتی ہے جیسے ظہر اور عصر کے درمیان طواف کرنے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ لیکن الحمدللہ بہت ساری اور غلط فہمیوں کی طرح یہ غلط فہمی بھی جلد ہی دور ہوگئی۔

سعودی عرب رقبے کے اعتبار سے بہت وسیع ملک ہے۔ اس لیے موسموں میں بھی تنوع ہے۔ اگرچہ یہ تنوع وطن عزیز کی طرح نہیں ہے۔ وطن عزیز تو اس دنیا پر ایک ایسی ''جنت'' کی طرح ہے جسے ہماری کم ہمتی یا کم نصیبی نے ''گم گشتہ'' دیا ہے۔ ورنہ رقبے کے اعتبار سے نسبتاً چھوٹے ملک میں ہر موسم کا، ہر طرح کے لینڈ سکیپ، اور ہر فصل کا موجود ہونا ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔ سعودی عرب کے جنوبی حصوں میں سردیوں میں برف باری بھی ہوتی ہے، جسے ''طریف'' میں۔ اسی طرح موسم سرما کافی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ گرمیوں میں مکہ کا سفر کرتے ہوئے جب طائف سے گزریں تو موسم کے تغیر کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔ طائف کے آتے ہی شدید گرمی میں بھی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے، اگرچہ مکہ اور طائف کا فاصلہ صرف چھیاسی کلومیٹر ہے۔ طائف کی بلند و بالا چیئر لفٹ کا نظارہ بھی بہت مسحور کن ہے۔

مدینہ شریف میں بھی سردی کافی شدید ہوتی ہے۔ شرقی صوبہ میں، جس میں جبیل، دمام، خبر اور ظہران شامل ہیں، موسم لاہور جیسا ہے، سردیوں میں سردی اور گرمیوں میں گرمی۔ ریاض میں بھی سردی شدید ہوتی ہے، اور درجہ حرارت اکثر صفر سے چار ڈگری تک چلا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ جب ہوا چلتی ہے تو کم سردی بھی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ بعض اوقات ہوا اس قدر تیز ہوتی ہے کہ لگتا ہے آپ بھی ہوا کے ساتھ اڑ جائیں گے۔ گاڑیاں بھی چلتے ہوئے ہوا کی شدت سے لہرا جاتی ہیں۔ بارشیں عموماً سردیوں میں ہوتی ہیں اور موسلا دھار ہوتی ہیں۔ درخت گرتے ہیں، چھتیں ٹپکتی ہیں اور سڑکیں دریا بن جاتی ہیں۔ لیکن اس سب کچھ کو فوراً ہی سنبھال لیا جاتا ہے۔ جی ہاں اور بجلی بھی جاتی ہے۔ ایک بار جب ایسی ہی بارش ہوئی تو ہماری بجلی چلی گئی۔ گھر میں ہر کام بجلی کا مرہون منت تھا۔ چائے کی پیالی بنانی ہو یا فون چارج کرنا ہو، کچھ بھی بجلی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ نہ لالٹین، نہ موم بتی اور نہ کوئی ایمرجنسی ٹارچ۔ پتہ چلا کہ بارش کی وجہ سے بڑی خرابی ہے اور بجلی شاید کل تک آئے۔ ابھی عصر کا وقت تھا۔ رات دس بجے تک تو ہم بچوں سمیت باہر گھومتے رہے اور الخبر چلے گئے۔ ابھی جاتی گرمیاں تھیں، لیکن شکر ہے کہ انسولیشن کی وجہ سے گھر قابل برداشت تھا۔ رات کو واپسی ہوئی، اور چند گھنٹوں کے بعد ہماری بجلی بحال ہوگئی، لیکن باقی ساری ہاؤسنگ کی بجلی اگلے دن دوپہر دو بجے آئی۔

لیکن سات سالوں میں ایسا ایک ہی بار ہوا۔ اسی بارش میں ہمارے ہسپتال کی سڑک دریا بن گئی، سٹاف کے کئی لوگوں نے وڈیو بھی بنائی، لیکن ہسپتال کے قانون کی وجہ سے اسے سوشل میڈیا پر ڈالنا ممنوع تھا۔ شکر ہے کہ ایک دن کے بعد سب کچھ نارمل ہوگیا۔ اسی طرح کی ایک بارش میں ایک درخت اس طرح ہمارے گھر والی سڑک پر گرا کہ ہم گاڑی نہیں نکال سکتے تھے۔ لیکن وہاں گاڑی کی ایسی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی، درخت بھی شام تک ہٹ گیا۔ ہلکی بوندا باندی والی بارش بھی سردیوں میں ہوتی رہتی ہے۔ جس دن ہمارا جبیل میں آخری دن تھا، اسی دن ہماری ایک الوداعی دعوت تھی۔ اسلام آباد کے لیے ہماری پرواز رات کی تھی۔

چوبیس گھنٹے مسلسل بوندا باندی ہوتی رہی۔ اسی بوندا باندی میں جہاز نے اڑان بھری۔

عموماً بارش بہت زیادہ نہیں ہوتی، اس لیے توقع سے زیادہ ہو جائے تو کئی دکانوں کی بھی چھت ٹپکنے لگتی ہے۔

گرمیاں بہت لمبی نہیں ہوتیں۔ جیل میں گرمی کا آغاز مئی میں ہوتا ہے اور ستمبر میں موسم خوشگوار ہو جاتا ہے۔ مئی میں درجہ حرارت لاہور سے بہت کم ہوتا ہے۔ آپ آرام سے باہر چہل قدمی کر سکتے ہیں، شام کو ساحل سمندر لطف اٹھا سکتے ہیں اور گرمی آپ کے قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔ گرمی کی شدت جون میں شروع ہوتی ہے۔ شدید گرمی میں بھی درجہ حرارت ایک سانہیں رہتا، اگر ابھی پینتالیس سے اوپر ہے تو دن ڈھلتے ہی تیس سے پینتیس تک آ جائے گا۔ جون میں بھی عبایا پہن کر آسانی سے رات کو سیر کی جا سکتی ہے۔

سب سے مشکل مہینے جولائی اور اگست کے ہوتے ہیں جن میں حبس شدید ہوتا ہے۔ ہم گیارہ اگست اور گیارہ ہی رمضان کو پہلی بار مملکت میں داخل ہوئے تھے قیام کے لیے۔ فجر کے وقت مجھے ہسپتال جانا پڑا اور میں نے جیسے ہی گھر کا دروازہ کھولا اور باہر نکلی، تو ایسا لگا کہ ہوا نہیں پانی ہر طرف بھرا ہوا ہے۔ نمی کے بوجھ سے ہوا اس قدر بھاری تھی کہ سانس لیتے ہوئے اس کے اندر جانے کا احساس ہوتا تھا۔ ان مہینوں میں حبس کی وجہ سے دھند چھا جاتی تھی۔ ہاتھ اس قدر گیلے لگتے تھے جیسے پانی سے نکالے ہوں۔

ریاض کا موسم اس اعتبار سے مختلف ہے کہ یہاں پر حبس نہیں ہوتا۔ گرمی خشک اور شدید ہے۔ دن میں درجہ حرارت پچاس ڈگری تک بھی چلا جاتا ہے، لیکن صحرا ہونے کی وجہ سے رات نسبتاً ٹھنڈی ہے۔ فجر کے وقت عموماً درجہ حرارت چالیس ڈگری سے نیچے رہتا ہے۔ گرمی ہی نہیں ریاض میں سردی بھی خوب رنگ دکھاتی ہے۔ جب ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے آتے ہیں تو چار کا درجہ حرارت بھی منفی لگتا ہے۔ ہوا کی شدت اس قدر ہوتی ہے کہ آپ خود بخود لہرانے لگتے ہیں۔ ایک اور دلچسپ بات جو بچوں کی من بھاتی ہے، وہ بارش کے دوران سکول سے چھٹی تھی۔ ہلکی پھلکی بارش کی تو خیر ہوتی تھی، اگرچہ بچے اسے بھی موسلا دھار بنانے کی کوشش کرتے تھے، لیکن زیادہ بارش میں محکمہ شہری دفاع کی طرف سے چھٹی کا پیغام آ جاتا تھا۔ اس لیے خراب موسم میں بچے بار بار مجھ سے آ کر میری ای میل چیک کراتے تھے کہ پیغام آیا یا نہیں۔ مجھے پچھلے سال کی سردیاں یاد ہیں۔ تقریباً دو ہفتے درجہ حرارت صفر کے آس پاس رہا۔ جب چوبیس گھنٹے کی آن کال ہوتی تھی تو بہت اچھا لگتا تھا کہ باہر کی ہوا کے اثرات سے بچ گئے۔ باہر سے آنے والوں پر بڑا ترس آتا تھا جب وہ ہسپتال کے اندر آ کر سردی کا ذکر کرتے تھے، اور خود پر بڑا پیار آتا تھا کہ میں سردی سے بچ گئی۔

جی ہاں، ریت کے طوفان کے تذکرے کے بغیر موسم کا ذکر مکمل نہیں ہو سکتا۔ جس طرح مغرب میں برف کے طوفان آتے ہیں، اسی طرح سعودی عرب میں ریت کے طوفان آتے ہیں۔ عموماً اس کی پیشین گوئی محکمہ موسمیات کی طرف سے پہلے آ جاتی ہے۔ ایک بار مکہ کے سفر میں ریاض کے قریب شدید ریت کا طوفان آیا تھا۔ طوفان اس قدر خوفناک تھا کہ دیکھنے کی حد صفر ہو گئی تھی۔ اللہ نے خیر رکھی اور کچھ دیر کے بعد طوفان ختم ہو گیا۔

شہریت کا مسئلہ

ہمارے مریضوں میں زیادہ تر تو سعودی ہی ہیں لیکن پاکستانی مریض بھی آتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے ملازمت کی وجہ سے سعودی عرب میں مقیم ہوتے ہیں۔ کئی ایسے پاکستانیوں سے بھی کلینک میں ملاقات ہوئی جو اردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔ ایسی میری ایک مریضہ مجھے دکھاتی رہی، پھر اس کا آپریشن ہوا اور اللہ نے اسے بیٹی دی۔ اس کے بعد بھی وہ کلینک میں آتی رہی۔ اس کی قومیت کے خانے میں پاکستانی لکھا تھا۔ میں سمجھی کہ شاید غلطی سے لکھا گیا ہے، حالانکہ اس غلطی کے ہونے کے امکانات کافی نادر تھے۔ لیکن اس مریضہ نے تصدیق کی کہ

وہ پاکستانی ہے اگرچہ وہ کبھی پاکستان نہیں گئی۔ اس کی شادی سعودی سے ہوئی ہے۔ وہ سعودی عرب ہی میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی ہے۔ ایسے بہت سے پاکستانی خاندان ہیں جو چالیس پچاس سال سے یہاں رہ رہے ہیں لیکن ان کا رہن سہن پاکستانی ہی ہے۔ لیکن کچھ پاکستانی ایسے بھی ہیں جو پورے خاندان یہاں آ گئے اور کسی وجہ سے ان کا پاکستان سے تعلق ختم ہو گیا۔ ان میں سے کچھ کی شادیاں سعودیوں میں ہوگئیں، اس طرح اردو سے ان کا تعلق نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ سعودی عرب کے قانون کے مطابق اگر عورت کی شادی سعودی سے ہو جائے تو اسے سعودی قومیت نہیں ملتی، البتہ بچے سعودی ہوں گے۔ اسی طرح اگر سعودی خاتون کی شادی غیر سعودی سے ہو تو بچے سعودی نہیں ہوں گے۔ میری ایک اور مریضہ بھی پاکستانی تھی لیکن اردو سے قطعی ناواقف تھی۔ اس کی شادی بھی ایک سعودی سے ہوئی ہے اور اب اس کے بچے سعودی کہلائیں گے۔

ایک خاتون اپنی بیٹی کو لے کر میرے پاس آئیں۔ میں جب ہسٹری لے رہی تھی تو انہوں نے مجھ سے ایک آدھ بات اردو میں کی۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کیا آپ کبھی پاکستان گئی ہیں کیونکہ آپ نے اردو بولی ہے۔ وہ کہنے لگیں کہ ہاں میں ڈیرہ غازی خان ایک دو بار گئی ہوں۔ میں کچھ حیران ہوئی لیکن انہوں نے یہ بتا کر میری حیرت کا رخ موڑ دیا کہ ان کے والدین کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے تھا۔ ان کے والد ساٹھ سال پہلے وہاں سے سعودی عرب آ گئے۔ پھر انہوں نے اپنے بھائیوں اور بہن کو بھی سعودی عرب بلا لیا۔ اب ان کے خاندان کا کوئی فرد پاکستان میں نہیں ہے۔ وہ سب مملکت میں ہیں۔ ان خاتون کو اردو کی کچھ سمجھ تھی لیکن وہ بولنے پر قادر نہیں تھیں سوائے چند فقروں کے۔ ان کی شادی سعودی سے ہوئی تھی اس لیے بچوں کی قومیت سعودی تھی۔ سعودی مرد شادی کے لیے زبان کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ایسی خواتین جو عربی جانتی ہوں، ان کی شادیاں سعودیوں میں ہو جاتی ہیں۔ بہت سے سعودی بھی اردو سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں۔ ایک بار ایک انکوائری کے سلسلے میں ایک سعودی ماہر امراض بچگان ہمارے ہسپتال میں شریف لائے۔ انکوائری تو کچھ خاص سیریس نہیں تھی لیکن انہوں نے اردو بہت شاندار بولی۔ کئی بار مریضاؤں کے شوہر بھی اردو کے الفاظ اور چند فقرے بول لیتے ہیں۔ ایک بار میرے استفسار پر ان میں سے ایک نے بتایا کہ میرے بہت سے دوست پاکستانی ہیں یہ میں نے ان سے سیکھا ہے۔ چند اردو الفاظ اب عربی کی روزمرہ کا حصہ بن گئے ہیں جیسے بچہ، سیدھا۔

''Hemleys'' کے نام سے سعودی عرب میں ایک بین الاقوامی سٹور کے کھلونوں کے شوروم ہیں۔ ایک بار میں اپنی بیٹی کے لیے کھلونے لینے وہاں پر گئی۔ جس سیلز مین نے ہمیں کھلونے دکھائے اس کا تعلق جدہ سے تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے والدین پاکستان سے آئے تھے لیکن اب سعودی ہیں۔ وہ اردو کے چند فقرے بول لیتا تھا اور کچھ سمجھ بھی لیتا تھا۔ ایک بار میری ایک مریضہ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم حجاز سے ہو۔ حجاز سے مراد مکہ شریف، جدہ اور مدینہ شریف کا علاقہ ہے۔ میں بہت خوش ہوئی کہ مریضہ میری عربی سے متاثر ہوگئی ہے۔ میرے ساتھ ایک سعودی کنسلٹنٹ بھی ہے۔ میں نے جب اسے بتایا کہ ایک مریضہ نے مجھے ایسے کہا ہے تو اس نے مجھے بتایا کہ حجاز میں ایسے بہت سے سعودی ہیں جو غیر عرب ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ حرمین کی وجہ سے مختلف قومیتوں کا وہاں رہنا ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ قانونی یا دوسرے طریقوں سے وہاں بس جاتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ انہیں سعودی قومیت مل جاتی ہے۔

ہم اکثر اپنے حکمرانوں سے نالاں رہتے ہیں لیکن حکومتیں اچھے کام بھی کر رہی ہوتی ہیں۔ روہنگیا مسلمانوں کے مسائل اب تو سوشل میڈیا کی وجہ سے ساری دنیا کو معلوم ہوگئی ہیں، لیکن ہمارے یہ مظلوم بھائی شروع سے ہی ظلم وستم کا سامنا کر رہے ہیں۔ مسجد الحرام کے سامنے مکہ ٹاور میں موجود بہت سی دکانوں پر آپ کو روہنگیا سیلز مین ملیں گے۔ یہ سب

پاکستانی پاسپورٹ پر ہیں اور سعودی حکومت ان کے اقاموں کی باقاعدگی سے تجدید کرتی ہے۔ اس بارے میں پاکستان اور سعودی عرب کی حکومت کے درمیان تحریری معاہدہ ہے۔ ان کی تیسری نسل اب سعودی عرب میں ہے۔ مجھے یہ معلومات ایک روہنگیا سیلز مین نے فراہم کی ہیں۔ اللہ کرے کہ جلد حرمین پوری دنیا کے لیے کھل جائیں اور ان کی رونقیں دوبارہ بحال ہو جائیں تو آپ کو بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہو سکتا ہے۔

مدینۃ النبیؐ لاک ڈاؤن میں

لاک ڈاؤن کھلنے کے بعد ہم عید الاضحیٰ سے اگلے دن مدینہ شریف گئے۔ اس بار ایک مختلف مشاہدہ ہوا۔ مدینہ میں رش بہت کم تھا۔ سب مقامی لوگ تھے کیونکہ بین الاقوامی پروازیں بند تھیں کورونا کی وجہ سے۔ مقامی رہائش پذیر پاکستانیوں کی بڑی تعداد تھی۔ جس سڑک پر ہمارا ہوٹل تھا، وہاں باقی سب ہوٹل بند تھے۔ اسی طرح پوری سڑک پر ایک بقالہ (چھوٹی سپر مارکیٹ) کھلا ہوا تھا۔ اسی طرح پورے بلاک میں دو گفٹ شاپ کھلی تھیں۔ حرم کے جوانب میں سڑکیں بیحد خاموش تھیں۔ ایسی کچھ سڑکوں کی میں نے تصاویر لی تھیں۔ ہم حرم کی دیوار سے متصل مال میں گئے۔ پورے مال میں ایک کافی شاپ اور ایک دوکان کھلی تھی۔ ہم یہ سمجھے کہ شاید نماز کے اوقات کی وجہ سے دوکانیں بند ہیں لیکن کھلی ہوئی دوکان کے مالک نے بتایا کہ یہ دوکانیں گاہک نہ ہونے کی وجہ سے بند ہیں اور اب تبھی کھلیں گی جب حج اور عمرے کے ویزے کھلیں گے۔

حرم کے اندر بھی کورونا کے ضوابط کا بہت اچھی طرح خیال رکھا جا رہا تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں مسجد کے ہال کے اندر لے جانا منع تھا۔ سترہ سال سے کم عمر بچوں کا مسجد کے ہال میں جانا ممنوع تھا۔ ہال میں سے سب قالین، آب زمزم اور مصحف ہٹا دیے گئے تھے۔ سب خواتین اپنی جائے نماز لے کر آتی تھیں۔ فاصلہ رکھنے کے لیے نشان لگے ہوئے تھے اور ان پر سختی سے عمل درآمد کرایا جاتا تھا۔ ہر نماز کے بعد عملہ صفائی کرتا تھا، اور رات کو مسجد بند کر دی جاتی تھی۔ ریاض الجنہ بھی بند تھا۔ ہم مغرب کے وقت حرم پہنچے۔ اقامت کے دوران سب گیٹ بند ہو گئے کیونکہ زائرین کی تعداد پوری ہو گئی تھی۔ سیکیورٹی پر مامور فرد نے ہمیں بتایا کہ آپ باہر ہی تھوڑی دیر انتظار کریں، جب نمازی باہر آئیں گے تو گیٹ کھل جائیں گے اور پھر آپ اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود جو رونق حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں دیکھی ویسی کہیں اور نہیں دیکھی۔ اس زیارت کا بہت لطف آیا۔ چونکہ ایام تشریق تھے، اس لیے امام صاحب ہر نماز کے بعد تکبیر پڑھتے تھے، جو بہت اچھی لگتی تھی۔

ہسپتالوں میں سہولتیں

ہسپتال کی دنیا بھی ایک الگ ہی دنیا ہوتی ہے جہاں ہم زندگی کا ایک مختلف رخ دیکھتے ہیں۔ سعودی عرب کے ہسپتال کئی معاملات اور سہولتوں میں مغرب سے کافی آگے ہیں۔ ایک تو یہاں اہل افراد کے لیے داخلے کی پالیسی کافی نرم ہے۔ دوسرے جب تک مریض مکمل صحت یاب نہ ہو، اسے گھر نہیں بھیجا جاتا۔ ہسپتال میں لمبی مدت کے لیے رہنے والوں کے الگ وارڈ ہیں۔ جہاں مریض کئی کئی سال رہائش پذیر رہتے ہیں۔ اسی طرح پیدائشی معذور بچوں کو جن کی دیکھ بھال والدین گھر پر نہ کر سکیں، انہیں بھی ہسپتال ہی میں رکھا جاتا ہے۔ میرے پچھلے ہسپتال میں ایک بچی بڑے سر (Hydrocephalus) اور دیگر پیدائشی نقائص کے ساتھ پیدا ہوئی۔ وہ بچی ہسپتال کی نرسری میں ہی رہتی تھی۔ ہر سال عید پر نرسیں اس کے لیے عید کے تحائف کا اہتمام کرتی تھیں۔ اس کے والدین اسے باقاعدگی سے دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ اسی طرح ایک اور بچہ ہڈیوں کے پیدائشی نقائص کے ساتھ پیدا ہوا۔ اس کے نقائص اتنے زیادہ تھے کہ اس کے زندگی کے بارے میں پتہ نہیں تھا کہ وہ کب ختم ہو جائے۔ وہ بچہ بھی اپنی ساری زندگی ہسپتال میں گزار کر فوت ہو گیا۔ کورونا کی وبا کے دوران بار بار حکومت کی طرف سے پیغام آتا رہا کہ اگر آپ میں مرض کی کوئی علامت ہے، آپ غیر ملکی ہیں، آپ کے پاس قانونی کاغذات نہیں ہیں تو بھی آپ فری علاج کے مستحق ہیں۔

صرف ریاض میں بیس سے زیادہ جامعات ہیں، جن میں جامعہ نورہ بھی شامل ہے جو صرف لڑکیوں کے لیے ہے

تعلیم کا معیار

کچھ ذکر سعودی عرب کے تعلیمی اداروں کا بھی ہو جائے۔ ایک وقت تھا کہ سعودی عرب اور گلف سے بہت سے طلبہ پاکستان پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ اپنے زمانہ طالب علمی میں ہم نے فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں اپنی کئی عرب ساتھیوں کی شادیوں میں شرکت کی تھی۔ اب وقت نے اپنے آپ کو ایسا بدلا ہے کہ پورے گلف نے بہترین تعلیمی ادارے قائم کر لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جو ارشاد فرمایا ہے، اس کا مفہوم ہے کہ ہم دنوں کو لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں۔

سعودی عرب میں اب بہترین جامعات اور طبی سکول قائم ہیں۔ حکومت نے طب اور تعلیم کے شعبے پر بہت سرمایہ کاری کی ہے۔ نہ صرف ملک کے اندر بہترین ادارے قائم کیے گئے ہیں بلکہ بیرونی اداروں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی فراخدلی کے ساتھ وظائف دیے جاتے ہیں۔ میرے بیٹوں کا ایک سعودی دوست بھی اپنی بہن کے ساتھ مانٹریال میں مقیم رہا۔ اس کی بہن کو پی ایچ ڈی کے لیے سعودی حکومت کی طرف سے وظیفہ ملا تھا۔ جب سعودی عرب اور کینیڈا کے تعلقات منقطع ہوئے تو ایسے سارے وظائف امریکہ اور دیگر ممالک کی طرف منتقل کر دیے گئے۔ دمام میں ''کنگ فہد یونیورسٹی آف پیٹرولیم اینڈ منرلز'' (KFUPM) ہے۔ اس یونیورسٹی میں تعلیم کے ساتھ ہر طالب علم کو ایک ہزار ریال ماہانہ وظیفہ بھی ملتا ہے۔ یہ جامعہ عموماً ہر سال بین الاقوامی QS رینکنگ میں انجینئرنگ کے لیے دنیا کی پہلی پچاس جامعات میں شامل ہوتی ہے۔ اسی طرح کنگ سعود یونیورسٹی ریاض اور کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ بھی پہلی پچاس جامعات کی فہرست میں شامل رہتی ہیں۔ طب کے علاوہ ہر شعبے میں غیر سعودی داخلہ لے سکتے ہیں اور اس کے لیے انہیں بھی ویسے ہی وظائف ملتے ہیں جیسے سعودی شہریوں کو۔ طب کے لیے نجی شعبے میں ایک بہترین سکول کنگ فیصل میڈیکل کالج ریاض ہے۔ اس سکول میں غیر سعودی بھی داخلہ لے سکتے ہیں۔ صرف ریاض میں بیس سے زیادہ جامعات ہیں، جن میں جامعہ نورہ بھی شامل ہے جو صرف لڑکیوں کے لیے ہے۔

اسی طرح ہمارے ہسپتال میں CME(continuing educationmedical کا شعبہ تھا جس کے تحت پورے سال میں بے شمار تعلیمی سرگرمیاں ہوتی تھیں۔ سال میں ایک بار ''کوالٹی ویک'' منایا جاتا تھا جس میں پورا ہفتہ مختلف سیمینار اور ورکشاپس کے علاوہ کئی اور پروگرام ہوتے تھے، جیسے کوئز، نمائش، پینٹنگ کا مقابلہ وغیرہ۔ یہ سب ہمارے میڈیکل کے شعبے سے متعلق ہوتا تھا۔ اس کا یہ فائدہ تھا کہ سٹاف کئی چیزیں تفریح میں ہی سیکھ لیتا تھا۔ یہی طریقہ میرے موجودہ ہسپتال میں بھی کورونا کی وبا سے پہلے تک تھا۔ اسی طرح ہمارے ہسپتال کی ''Research and ethics committee'' کے لیے ضروری تھا کہ وہ سال میں کم از کم آٹھ بار میٹنگ بلائے۔ جب ہمارے ٹریننگ لینے والے ڈاکٹر زیادہ ہوتے تھے اور ہمیں ان کے تحقیقی مقالے منظور کر کے آگے بھیجنا ہوتے تھے تو بعض اوقات ہم میٹنگ جلدی بلا لیتے تھے۔ اکثر ممبران دھواں دھار بحث کرتے تھے۔ چھوٹی موٹی غلطیوں کو تو نظر انداز کر دیا جاتا تھا، لیکن کسی اہم غلطی کا نظروں سے بچنا ناممکن تھا۔ ہمارے ہسپتال کے تحقیقی مضامین ''New England Medical Journal'' میں بھی چھپے۔ ہمارے میڈیکل ڈائریکٹر کچھ عرصہ ایک پاکستانی ڈاکٹر رہے۔ وہ بہت اچھے محقق اور استاد تھے۔ کچھ وجوہات کی بنا پر انہیں سعودی عرب سے واپس آنا پڑا۔ ان دنوں وہ طب پر ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ ان کی اہلیہ بھی بہت شائستہ خاتون ہیں اور ڈاکٹر ہیں۔ وہ ملازمت نہیں کرتی تھیں۔ ان کی بہت ساری خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہماری پیاری ڈاکٹر کوکب خان[1] کی بہت اچھی دوست ہیں۔ ہماری ہاؤسنگ میں وہ ہفتہ وار قرآن کلاس لیا کرتی تھیں۔ میری بیٹی بھی ان کی شاگرد تھی۔

ایک اور بہت دلچسپ اور فائدہ مند سرگرمی جو میرے پچھلے

[1] اڈیشنل سرجن (لاہور) ممبر صوبائی شوریٰ (پنجاب)

ہسپتال میں تھی، وہ ''Ethical Rounds'' تھے۔ اتھکس کا شعبہ ترقی پذیر ممالک میں ابھی بے حد نیا ہے۔ ہمارے ہسپتال میں جب یہ شعبہ شروع ہؤا تو ریسرچ کمیٹی کے ساتھ ساتھ مجھے اس کمیٹی کا بھی سربراہ بنا دیا گیا اور دونوں کمیٹیوں کو اکٹھا کر دیا گیا۔ اس شعبے کے بارے میں آگاہی دینے کے لیے ہم نے بہت سی سرگرمیاں کیں جن میں سے ایک اتھکس راؤنڈ تھے۔ ہسپتال کے مکمل طور پر مصروف نظام اوقات میں سے ان راؤنڈز کو منظّم کرنا اور سٹاف کو اس میں شامل کرنا بہت مشکل کام تھا لیکن ہم نے بہت کامیابی سے اس کام کو کیا اور اتھکس جیسے نئے شعبے کو ہسپتال کا سب سے مقبول شعبہ بنا دیا۔ سٹاف بھی دلچسپی کے ساتھ اس میں شریک ہؤا اور ہمیں بہت مثبت فیڈ بیک ملا۔

سفر اور تفریح

سعودی عرب کی شاہراہیں طویل ہیں کیونکہ یہ رقبے کے اعتبار سے کافی بڑا ملک ہے، اور یہاں کے باشندے ہوائی سفر کے ساتھ ساتھ سڑک کے ذریعے سفر کرنے کے بھی عادی ہیں اور شوقین بھی۔ گرمیوں کے موسم میں رات کے سفر کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جبیل سے مکہ شریف اور مدینہ شریف کا فاصلہ تقریباً تیرہ سو کلومیٹر ہے۔ جب ہم شروع میں آئے تو سب نے ہمیں گرمیوں میں دن کے سفر سے منع کیا کیونکہ درجہ حرارت پچاس تک پہنچ جاتا ہے اور اس سے گاڑی کے ٹائر پھٹنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ہم اکثر اپنا سفر عصر کے بعد شروع کرتے اور زیادہ تر سفر رات کو ہوتا۔ اگلے دن ظہر تک ہم حرم پہنچ جاتے تھے۔ راستے میں ہم کھانے اور نمازوں کے لیے رکتے تھے۔ ریاض اور چند شہروں کے علاوہ راستے ویران ہیں۔ کہیں کہیں گیس سٹیشن بنے ہوئے ہیں، جہاں سے ایندھن کے علاوہ آپ کھانے پینے کا سامان لے سکتے ہیں، مسجد ہے جہاں آپ نماز پڑھ سکتے ہیں اور کچھ سٹیشنوں (محطہ) پر آرام کے لیے کمرے بھی مل جاتے ہیں۔ دن رات کا کوئی تصور نہیں ہے۔ آپ جب چاہیں اور جہاں چاہیں گاڑی روک کر آرام سے کھا پی سکتے ہیں۔ اسی طرح صحرا اور ویرانے میں بھی آپ گاڑی روک کر آرام کر سکتے ہیں۔ یہاں کی شاہراہوں پر یہ منظر عام ہے کہ سڑک سے اتار کر گاڑی کھڑی ہے۔ ریت پر چادر بچھا کر نماز ادا کی جا رہی ہے۔ شوہر امامت کرا رہا ہے اور بیوی بچوں کے ساتھ پیچھے کھڑی ہے۔ اسی طرح ریت پر بیٹھ کر لق و دق صحرا میں جہاں سڑک کے علاوہ کہیں آبادی کا نام و نشان نہیں، پورا خاندان کھانے پینے میں مصروف ہے۔ بعض اوقات ڈرائیور رات کو تھک جائیں تو سڑک سے گاڑی اتار کر ایک طرف کھڑی کر دیتے ہیں اور گاڑی ہی میں سو جاتے ہیں۔ ہم جبیل سے ہر جمعرات کی شام یا جمعے کو الخبر جاتے تھے اور رات کو دیر سے واپس آتے تھے۔ رات کے بارہ بجے بھی سڑک ٹریفک سے بھری ہوئی ہوتی تھی۔

ایک اور ذریعہ تفریح یہاں پر صحرا میں رات گزارنا ہے۔ لوگ خاندان یا دوستوں کے ساتھ صحرا میں چلے جاتے ہیں۔ اس کے لیے کچھ جگہیں مخصوص ہوتی ہیں اور راستے بھی ہوتے ہیں۔ لوگ اپنے خیمے، بار بی کیو کا سامان ساتھ لے آتے ہیں اور اکثر فجر کے بعد واپسی ہوتی ہے۔ شاہراہوں پر بنے بقالوں میں کوئلے اور برف عموماً آسانی سے دستیاب ہوتی ہے۔ اسی طرح صحرا میں بائک چلانا بھی ایک دلچسپ کھیل تھا جو ہمارے بیٹے بڑے شوق سے کھیلنے جاتے تھے۔ اس کے لیے صحرا میں ٹریک بنے ہوئے تھے جہاں بائک دوڑائی جاتی تھی۔ اس کے لیے بہترین وقت فجر کا تھا۔ بچے فجر سے پہلے نکل جاتے تھے تاکہ وقت پر وہاں پہنچ سکیں۔

پاکستان میں اکیلے سفر

یہ سب باتیں مجھے لاہور میں موٹروے پر ہونے والے حالیہ واقعہ کے تناظر میں یاد آ گئیں۔ اس واقعے نے دل کو دکھ سے بھر دیا اور وطن عزیز میں قیام کے دور کی کچھ پرانی باتیں یاد آ گئیں۔ ماہر امراض زچہ بچہ ہونے کی وجہ سے مجھے دن رات میں کسی بھی وقت ہسپتال سے کال آ جاتی تھی۔ بعض اوقات آدھی رات کو ہسپتال جانا پڑتا تھا۔ ڈرائیور کو بے آرام کرنے کے خیال سے اور جلدی کی وجہ سے بھی میں خود ہی گاڑی چلا کر چلی جاتی

تھی۔ایک بار میں سردیوں کی رات میں تقریباً تین چار بجے جوہر ٹاؤن مین بلیوارڈ سے گزر رہی تھی تو اچانک میری گاڑی کو زبردست دھکا لگا۔ میں نے لاشعوری طور پر اچانک بریک لگا دی۔ دیکھا تو ایک بھینس سامنے تھی۔اس ٹکر نے گاڑی کی ونڈ اسکرین کو چور چور کر دیا۔ہؤا یوں کہ فجر سے پہلے گوالا بھینسوں کو کہیں ٹہلانے یا شاید دوہنے کے لیے لے جا رہا تھا۔مکمل اندھیرا تھا اور بھینس بھی سیاہ رنگ کی تھی۔سڑک پر بھی روشنی نہیں تھی۔میرے ذہن میں بھی کہیں یہ خیال نہیں تھا کہ اس وقت خالی سڑک پر کوئی بھینس آ سکتی ہے۔خیر بھینس تو بچ گئی،اور میں نے بھی گاڑی دوبارہ دوڑا دی کیونکہ جس مریضہ کے لیے میں جا رہی تھی،اس کا بلڈ پریشر بہت زیادہ تھا اور بچے کی حالت کی وجہ سے ایمرجنسی آپریشن کی ضرورت تھی۔ سارا راستہ ٹھنڈی ہوا منہ پر پڑتی رہی۔ہسپتال جا کر گاڑی ایک طرف کھڑی کی تا کہ کسی کو ونڈ اسکرین نظر نہ آئے۔آپریشن کیا، بچہ ٹھیک تھا۔ ماں کی حالت بھی بہتر تھی۔

جب مریضہ کی فکر ختم ہوئی تو حادثے کی شدت کا احساس ہؤا۔ جب واپسی پر گاڑی موڑی تو چوکیدار فوراً پوچھنے آ گیا کہ گاڑی کو کیا ہؤا ہے۔اسے ٹالا اور گاڑی چلا دی۔ پورا راستہ کانپتی کانپتی گھر پہنچی۔میاں صاحب نے جب تھوڑا ڈانٹنے کی کوشش کی تو انہیں کہا کہ آپ شکر کریں، میں بچ گئی ہوں۔ وہ خاموش ہو گئے۔اس واقعے سے کچھ عرصہ پہلے پاکستان میں ڈاکٹروں کے اغوا برائے تاوان کے کئی واقعات ہوئے۔ان میں ایک مشہور ڈاکٹر صاحبہ بھی شامل تھیں۔تاوان لے کر ڈاکو ڈاکٹر کو چھوڑ دیتے تھے(میں بھی جب سعودی عرب آئی تو کچھ کولیگز کا خیال تھا کہ شاید مجھے بھی تاوان کی دھمکی ملی ہے)۔

اسی طرح ایک بار سردیوں کی رات میں تقریباً بارہ بجے میں ہسپتال سے گھر آ رہی تھی۔ رات کو لوڈ شیڈنگ بھی ہوتی تھی۔ گھپ اندھیری سڑکیں تھیں۔ٹھوکر نیاز بیگ کے قریب مجھے پیچھے سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائیٹ پڑیں۔ میں نے توجہ نہیں دی۔تھوڑا آگے جا کر پولیس کی ایک گاڑی نے میرے آگے آ کر مجھے روک لیا۔ جب انہوں نے اتر کر مجھے دیکھا تو پیچھے ہٹ گئے،اور کہا کہ آپ جائیں۔ساتھ ہی ایک نصیحت بھی کی۔کہ جب پولیس اشارہ دے تو گاڑی ضرور روکیں ورنہ پولیس گولی چلا سکتی ہے،یہ سمجھ کر کہ کوئی مجرم ہے۔

موٹروے پر پر بھی میں نے کئی بار بچوں کے ساتھ اکیلے گاڑی چلائی ہے۔بعض اوقات رات بھی ہو جاتی تھی۔چھوٹے بچے رونے لگتے تھے تو کسی رکنے والی جگہ گاڑی روک کر انہیں گود میں لے کر بہلانا بھی پڑتا تھا۔اسی طرح میں جب پوسٹ گریجویشن کر رہی تھی تو دو بچوں کے ساتھ بہت بار گاڑی چلا کر لاہور سے مانگا منڈی بھی جاتی تھی۔ہم اس وقت تقریباً ایک سال مانگا میں بھی رہے۔آج سے بیس سال پہلے مانگا منڈی اور لاہور ایک شہر نہیں تھے۔

اس سے بھی پہلے کی بات کریں تو میں نے ایف ایس سی لاہور کالج سے کی تھی،اور میڈیکل فاطمہ جناح میڈیکل کالج سے۔ ہمارا گھر گاؤں میں تھا،اس کا قریبی شہر منڈی بہاؤالدین تھا، جہاں سے براہ راست بس لاہور نہیں آتی تھی۔شروع میں تو ابو چھوڑنے لینے آتے تھے پھر ابو گاڑی میں بٹھا جاتے تھے، گجرات سے بس بدل کر میں لاہور آتی تھی۔بس اڈے سے رکشہ لے کر ہاسٹل پہنچ جاتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد ہمارے شہر منڈی بہاؤالدین سے لاہور کے لیے براہ راست کوسٹر سروس شروع ہوئی۔اس میں تیرہ یا سترہ سیٹیں ہوتی تھیں۔فجر سے پہلے ہم گھر سے نکلتے تھے۔ابو مجھے کوسٹر میں بٹھا کر واپس چلے جاتے تھے۔ مجھے اکثر ڈرائیور کے پیچھے والی سنگل سیٹ پر بٹھایا جاتا تا کہ کوئی مرد ساتھ نہ بیٹھے۔ بعض اوقات سارا سفر فولڈنگ سیٹ پر بیٹھ کر کرنا پڑتا کیونکہ اور کوئی ایسی سیٹ نہیں ہوتی تھی جس پر کوئی خاتون بیٹھی ہوں۔

یہ سب باتیں اس لیے یاد آئیں کہ موٹروے کا سانحہ ایک اچنبھا لگا۔اسی ملک میں آج سے چند سال پہلے میں اکیلی پھرتی رہی۔ذہن میں کوئی بات آئی بھی تو وہ چوری یا ڈکیتی کے حوالے سے تھی۔اغوا بھی ہوئے تو تاوان لے کر چھوڑ دیا گیا،خاتون کی عزت پر حرف بھی نہیں آیا۔سوچتی ہوں کیا اب ہمیں بدعنوانی میں بھی انتخاب کرنا پڑے گا کہ کون سی بدعنوانی کو بہتر سمجھیں تا کہ اس مصیبت سے بچ سکیں،اور عورت کی عزت محفوظ رہے؟☆

(جاری ہے)

ذروہ احسن

بے بسی

آج پھر میری اپنی ماں اور بہن سے زبردست بحث ہوئی تھی۔ غصے میں آ کر میں بغیر ناشتہ کیے گھر سے نکل آیا تھا اور اب پیٹ میں چوہے کو درہے تھے۔ کھانے کا وقفہ ہوا تو میں قریبی ریستوران میں چلا گیا۔ سیلف سروس کاؤنٹر سے شیک اور برگر لے کر ایک کونے کی میز پر بیٹھ گیا اور کھانے پر ٹوٹ پڑا، پیٹ میں کچھ پڑا تو ہوش ٹھکانے آئے۔ اب میں نے ذرا ارد گرد نظر دوڑائی۔ ریستوران میں کافی رش تھا کیوں کہ اس علاقے میں کئی ایک دفاتر تھے۔ ابھی میں جائزہ لینے میں مصروف تھا کہ میرے کانوں سے کسی کی آواز ٹکرائی۔

''زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے۔ ان عورتوں کو ہم مردوں کے جذبات واحساسات کی کوئی پروا نہیں یہ اپنی ہی مرضی چلائیں گی۔ ان کے خیال میں ہم مرد ناقص العقل ہیں۔ اپنا برا بھلا نہیں سمجھ سکتے''۔

آہ! میرے دل سے آواز اٹھی۔ یہ بھی کوئی میری طرح کا حرماں نصیب ہے۔ میری امی بھی تو مجھے اب تک ایک دودھ پیتا بچہ سمجھتی ہیں جسے دنیا کی کچھ خبر نہیں۔

میں نے آواز کی سمت گردن گھمائی۔ بالکل پیچھے والی میز پر ایک جوان آدمی بیٹھا تھا۔ کسی زمانے میں یقیناً خوش رو ہوگا مگر اب تو چہرے پر تفکرات نے لکیریں کھینچ دی تھیں۔ بال وقت سے پہلے اڑنے شروع ہو گئے تھے جس سے عمر زیادہ معلوم ہو رہی تھی۔

وہ پھر بڑبڑانے لگا۔''کوئی احساس نہیں کہ سارا دن دفتر میں کتنی مغز ماری کرنا پڑتی ہے۔ فائلوں کا انبار، کلائنٹس سے متھا ماری، باس کی جھاڑیں۔ اس پر بھی صبح ہی صبح وہی چخ چخ بک بک۔ کاش یہ مائیں بہنیں ہم پر اتنا دباؤ نہ ڈالا کریں تو.....''

مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی ان ہی حالات کا شکار ہے، جن کا میں۔ میں نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا کہنا بالکل درست ہے۔ میں بھی آج اپنی ماں اور بہن کی وجہ سے بغیر ناشتہ کیے دفتر آ گیا تھا۔ منتشر ذہن اور بھوکے پیٹ کے ساتھ کام کرنے کا نتیجہ ظاہر ہے۔ بے شمار غلطیاں ہوئیں۔ باس سے جھاڑ بھی پڑی اور وارننگ لیٹر بھی مل گیا''۔

اس نے خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھا۔''آپ کا جھگڑا کس وجہ سے ہوا؟''

''کیا بتاؤں''۔ میرے لہجے میں افسردگی در آئی۔''میں اپنی ایک کولیگ سے شادی کرنا چاہتا ہوں جبکہ ماں اور بہن راضی نہیں۔ وہ اپنی مرضی سے میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔ ثمینہ میں کوئی برائی نہیں۔ ذات، برادری، سوشل اسٹیٹس۔ ہر چیز میں وہ ہمارے ہم پلہ ہے مگر ماں اور بہن کی یہی رٹ ہے کہ لڑکی ہم پسند کریں گے۔ ہوسکتا ہے وہ خود ڈھونڈنے نکلتیں تو ثمینہ کو ہی میرے لیے منتخب کرتیں۔ مگر اب تو یہ ضد ہے کہ میری بتائی ہوئی لڑکی سے شادی نہیں کرنی چاہے دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے۔ ادھر میں بھی اڑا ہوا ہوں کہ شادی کروں گا تو صرف اور صرف ثمینہ سے''۔ میں نے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

''وہی..... بالکل وہی''۔ وہ آدمی ہذیانی انداز میں بولا۔

''ہر گھر کی یہی کہانی ہے۔ آہ! یہ ضد کتنی زندگیوں کو تباہ کرے گی''۔ اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ کر سر کو جھٹکے دیے خوب! میرا اندازہ درست نکلا۔ میرا یہ دوست بھی (ہاں، وہ مجھے دوست ہی معلوم ہوا، ہمارا درد جو مشترک تھا) میری طرح ماں بہن کی ناجائز ضد اور جذباتی بلیک میلنگ کا شکار نظر آ رہا تھا۔

''آپ کا کیا قصہ ہے؟ کہہ دیجیے۔ کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے''۔ میں نے اسے اکسایا۔

وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔''میں جس سے شادی کرنا چاہتا تھا، وہاں گھر والے راضی نہیں تھے روز لڑائی جھگڑا، ضد اور بحث ہوتی۔ ماں کہتی، دودھ نہیں بخشوں گی۔ بہنیں ساری عمر بات نہ کرنے کی دھمکی دیتیں۔ میں بھی ڈٹ گیا، آخر ان ہی کا خون تھا۔ بھلا یہ کوئی بات ہے کہ زندگی میری اور فیصلے کوئی اور کرے؟ باپ اور بھائی غیر جانب دار تھے۔ میں اکیلا ہی اپنا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ بہت عرصہ یہ قصہ چلتا رہا اور پھر میں ہار گیا۔ ہاں، میں اسے اپنی ہار ہی کہوں گا۔ میری شادی ہوگئی۔

ماں اور بہنیں اب خوش تھیں لیکن میری زندگی اجیرن ہوگئی۔ ہر وقت پوچھ گچھ ہر وقت سوال جواب یہ کیوں کیا، وہ کیوں نہ کیا؟ دیر سے کیوں آئے ہو؟ اتنی شوخ ٹائی باندھ کر کہاں جا رہے ہو؟ سارا پرفیوم کیوں چھڑکا ہے؟ فون کیوں انگیج رہتا ہے؟ یہ کیوں کھایا؟ وہ کیوں پہنا، یہاں کیوں گئے، اس سے کیوں ملے؟

''بعض اوقات تو مجھے لگتا ہے کہ میری دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ اتنی سی عمر میں مجھے شوگر اور بلڈ پریشر ہو گیا ہے۔ اکثر آدھے سر میں درد رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو خودکشی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ہر وقت شک، ہر وقت جرح۔ مجھے اپنا آپ مجرم معلوم ہونے لگتا ہے''۔ وہ ہانپنے لگا۔

''چچ چچ چچ'' میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی، ترس اور رحم کے جذبات امڈ آئے۔''افسوس! آپ کی شادی اپنی منتخب کردہ خاتون سے نہ ہو سکی۔ اگر ہو جاتی تو شاید.....''

''جی نہیں۔'' اس نے تیزی سے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''آپ غلط سمجھے میری شادی ان ہی محترمہ سے ہوئی ہے''۔

☆.....☆.....☆

عبید حارث

ناول نگاری کی آرزو

پچھلے پانچ منٹ سے ہم گلی میں لوگوں کو پکڑ پکڑ کر خود سے بنایا ایک جملہ سنا رہے تھے۔لوگ اس کو سن کر واہ واہ کرتے اگر کسی کو سمجھ نہ آتا تو ہم اس کو زبردستی تین چار بار سناتے اور جب تک وہ تعریف نہ کر دیتا اس کو جانے نہ دیتے۔دل اندر ہی اندر تعریف سن کر پھولے نہ سماتا۔

تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ اگر لوگ ایک جملے پر اتنی واہ واہ کر رہے ہیں تو کیوں نہ مضمون ہی لکھ دوں ، پھر تو لوگ دعوت ہی کر دیں گے۔دل کی یہ آرزو ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک خیال اور آیا، کیوں نہ ہم ناول ہی لکھ دیں ! لوگ قیمتی انعامات اور انٹرویو لینے کے لیے بے تاب ہوں گے۔

یہ خیال آنا تھا ہم دیوانوں کی طرح لوگوں سے ناول نگاری کا پوچھنے لگے۔کسی نے بتایا کہ فلاں جگہ آج ناول نگاری پر سیمینار ہو رہا ہے جس میں ملک کی مشہور ناول نگار محترمہ فرزانہ صاحبہ آئیں گی ۔ ہم گھر واپس آئے گھر والوں کو کہا کہ کسی کام کے سلسلے میں جا رہا ہوں رات تک واپسی ممکن ہوگی پھر بس میں بیٹھ گئے۔

راستے میں سوچا دیکھو اللہ چاہتا ہے کہ پاکستان میں ایک اور ناول نگار منصّہِ شہود پر آئے ۔وہاں جا کر ان کو جملہ سناؤں گا تو وہ مہمان خصوصی کے برابر والی نشست پر بیٹھائیں گے ۔ ایک گھنٹہ سفر میں گزارنے کے بعد وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ سیمینار شروع ہو چکا ہے۔کاؤنٹر پر ایک صاحب کہنے لگے کہ پروگرام میں شرکت کرنی ہے تو پانچ سو روپے زرِتعاون دینا ہوگا۔ہم نے اُن کو بھی وہ جملہ سنایا اور کہا کہ بھائی ناول لکھنے کی آرزو جاگی ہے ہمارے دل میں۔ پر ان کو تو ہمارے جملے سے کوئی سرو کار نہ تھا۔اُن کی ساری دلچسپی پیسوں سے تھی کہ ہم کسی طرح پیسے دے دیں ۔ہمیں تو ہر صورت سیمینار میں شرکت کرنی تھی مجبوراً پیسے دیے اور دبے لفظوں میں کہا کہ آپ کو مستقبل کے ناول نگار کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہے۔

ہال میں داخل ہوا تو وہ مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔دیر سے آنے کے باعث بہت سے لوگ میری طرف دیکھنے لگے۔خیال آیا کہ جب ناول لکھوں گا تو لوگ مجھے ایسے ہی دیکھیں گے۔ایک صاحب نے میرے ہاتھ سے پرچی لی اور کہا کہ وہاں آخری نشست پر بیٹھ جائیں ۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ انسان کی شروع میں کوئی عزت نہیں کرتا۔خیر ہم وہاں جا کر بیٹھ گئے ۔کوئی ڈھائی سو لوگ ناول نگار بننے کی خواہش لے کر آئے ہوئے تھے۔دل میں ایک خوش فہمی تھی کہ میرے جیسا جملہ اس ہال میں کسی کے پاس نہیں ہوگا۔

کوئی علی نامی صاحب اسٹیج کی ذمہ داری نبھا رہے تھے اور ناول نگاری کی چند چیدہ چیدہ باتیں بتا رہے تھے۔ان کی صرف آواز ہی سنائی دے رہی تھی۔اتنی دور بٹھایا تھا کہ اسٹیج تو نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔خیر ہمیں کسی کی شکل سے کیا لینا دینا۔

علی صاحب نے مہمان خصوصی کا تعارف یوں کرایا۔

''محترمہ فرزانہ صاحبہ کا شمار پاکستان کے مشہور ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔آپ نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ناول لکھے اور معاشرے کے مسائل کو بڑی خوبصورتی سے اُجاگر کیا''۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے ان کے چند مشہور ناولوں کے نام بتائے۔پھر فرمانے لگے،''اب میں آپ کے اور مہمان کے درمیان زیادہ دیر حائل نہیں ہونا چاہتا۔محترمہ کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ آئیں اور مستقبل کے ناول نگاروں کی رہنمائی فرمائیں''۔

مجھے یوں لگا کہ یہ جملہ صرف میرے لیے کہا گیا ہو۔ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

پہلی بار دل میں خواہش جاگی کہ اسٹیج کو دیکھ لیں۔ سیٹ سے اٹھا اور دیکھنے کی کوشش کی۔ غالباً علی صاحب محترمہ سے باتیں کر رہے تھے۔ محترمہ کی شکل سے زیادہ علی صاحب کا سر نظر آ رہا تھا۔ ہم مایوس ہو کر دوبارہ بیٹھ گئے۔

محترمہ نے تقریر شروع کی اور ناول نگاری کی اہمیت بتانے لگیں۔ اتنے میں ایک شخص پانی کی بوتلیں اور بسکٹ لے کر آیا اور سب کو دینے لگا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ پانچ سو روپے میں سے پینتیس روپے تو وصول ہو گئے۔ لوگ ایسے تقریر سن رہے تھے کہ کل ہی ناول نگار بن جائیں گے۔ ہمیں تو صرف ابتدائی رہنمائی مطلوب تھی کہ ناول شروع کیسے کریں۔ باقی تو جملے ذہن میں بے شمار آ رہے تھے۔

فرزانہ صاحبہ فرما رہی تھیں کہ ناول میں منظر نگاری کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ منظر نگاری پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ناول پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ناول کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔ پھر فرمانے لگیں کہ آپ کو ایک سادہ کاغذ دیا جائے گا اور دیوار پر کچھ تصویریں لگائی جائیں گی آپ کو اُس کی منظر کشی کرنی ہے۔ اس کے بعد سب کو ایک ایک سادہ کاغذ دیا گیا اور ساتھ پین بھی۔ اب وصول پیسوں میں دس روپے کا اضافہ ہو گیا تھا۔ سب لکھنا شروع ہو گئے۔

دو منٹ تک تو میں یہ ہی سوچتا رہا کہ کہاں لگی ہیں تصویریں! پھر کسی نے اسٹیج کی طرف اشارہ کر کے کہا وہ دیکھو۔ اٹھ کر دیکھا تو سامنے اتنی چھوٹی چھوٹی تصویریں لگی تھیں کہ کچھ سجھائی نہ دیا۔ البتہ آگے بیٹھے لوگوں کی پشت نظر آ رہی تھی۔ اگلی نشست پر بیٹھی خاتون تیسرا ورق مانگ رہی تھیں۔ میں نے اُٹھ کر دیکھا تو دونوں صفحات پورے بھرے ہوئے تھے۔ خدا جانے ان کو ان تصویروں میں کون سے لیلیٰ مجنوں نظر آ رہے تھے جو اتنی بڑی داستان لکھ رہی تھیں۔

ہم نے اپنے کاغذ پر نظر دوڑائی تو صرف تین سطور لکھ پائے تھے اور وہ کچھ اس طرح تھیں۔

''سورج نکلا ہوا تھا۔ ایک لڑکا جو کلین شیو تھا ایک طرف کھڑا تھا، ساتھ ہی ایک لڑکی بھی تھی''۔

سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اور کیا لکھیں لیکن لوگ صفحے تو ایسے لے رہے تھے جیسے سرکار مفت میں راشن بانٹ رہی ہو۔ وقت مقررہ ختم ہوا اور سب لوگ تحاریر واپس کرنے لگے۔ ہال میں صرف ہم ہی تھے جو مزید صفحات لینے میں کنجوس ثابت ہوئے۔ جبکہ باقی کسی نے دو، کسی نے تین اور کسی نے چار صفحات استعمال کیے۔

علی صاحب پھر مخاطب ہوئے اور کچھ لوگوں کی تحاریر سنانے لگے۔ کہنے لگے کسی نے تو صرف ایک شیٹ پر لکھا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ صفحہ میرا ہی ہے۔ ہال میں اے سی چل رہا تھا مگر جوں جوں وہ تحاریر سناتے جا رہے تھے مجھے اتنا ہی پسینہ آ رہا تھا۔ لوگ کسی کی تحریر پر داد دیتے، تو کسی کی تحریر پر خوب ہنستے۔ ایک میں ہی تھا جس کو نہ تو کچھ سمجھ آ رہا تھا اور نہ ہی کسی کی تحریر پر ہنسی۔ کچھ دیر بعد اتنا پسینہ آیا کہ اگر کوئی میری طرف دیکھتا تو کہتا کہ جناب والا آپ نے بوتل کا سارا پانی سر پر ڈالا ہے کیا؟ یہ نوبت آنے سے پہلے ہی میں کھڑا ہوا اور مددگار (Volunteer) سے پوچھا کہ واش روم کہاں ہے۔ انہوں نے ہال سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ میں فوراً ہال سے باہر آ گیا۔ واش روم تھوڑی جانا تھا، ہال سے باہر جانے کا بہانا ڈھونڈ رہا تھا۔

کاؤنٹر والا شخص بولا، کیا پروگرام ختم ہو گیا؟ میں نے کہا، ہاں اور آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔ یہ کہا اور میں وہاں سے نکلا۔

واپسی کے لیے بس میں بیٹھا اور سوچنے لگا کہ ناول لکھنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ کچھ دیر بعد سرگوشی میں کہا۔ ''دل کے ارمان پسینے میں بہہ گئے''۔ ساتھ بیٹھا شخص کہنے لگا، جناب ''دل کے ارمان آنسوؤں میں بہہ گئے ہوتا ہے''۔ اب ان کو کیا بتاتے کہ اے سی والے ہال میں ہمارا پسینہ تو بہا تھا!

☆.....☆.....☆

سیر وسفر ساتھ ساتھ

جب سے کرونا کا زور بلکہ خوف کم ہوا تھا ایک ہی خبر سنائی دیتی۔ فلاں شمالی علاقہ جات کی طرف گئے ہیں، فلاں کا مری کا پروگرام ہے اور فلاں تو سکردو سے واپس بھی آ گئے۔ دن رات اس طرح کی روداد بمعہ شکوہ جات کے چھوٹے یعنی داؤد عبداللہ اور چھوٹی یعنی زروہ تحریم کی طرف سے سننے کو ملتے۔ کبھی باپ کو سیر وتفریح کے موضوع پر بریف کیا جاتا اور کبھی اماں کو شیشے میں اتارا جاتا۔

خدا جانے کب تک یہ سلسلہ چلتا کہ دو بیٹیوں کے نصف بہترین کہ جن کو ہمارے داماد ہونے کا شرف حاصل تھا اپنے دوست احباب کے ساتھ خنجراب، سکردو روانہ ہوگئے۔ اماں ابا کا ایمان تو دامادوں کے بہتے جھرنے آبشاروں بلند پہاڑوں کے سٹیٹس دیکھ کر بھی قائم رہتا، بات تو چھوٹوں کی تھی۔ ہر وڈیو پر ایسے حسرت بھرے دل جلانے والے فقرے سننے کو ملتے کہ گول مول سا وعدہ کرتے بنتی۔ وہ جو کہتے ہیں ''مرے کو مارے شاہ مدار'' یہ لوگ واپس بھی نہ آئے تھے کہ داماد نمبر دو یعنی دوسری بیٹی کا سسرال بھی کاغان ناران اور شانگلہ کو پیارا ہوگیا۔ بس پھر کیا تھا.....دونوں کو مارے حیرت کے غش پڑ رہے تھے۔ یعنی یہ کیسے ممکن ہے کہ تینوں بہنوں کی سسرال سیر سپاٹے پر نکلی ہو اور ہم گھر میں قید!

کیا کہیے جناب.....بہتیرا گھر میں رہنے کے فوائد بتلائے مگر آج کی نسل کے پاس قائل کرنے کے لیے دلائل کے انبار موجود ہیں۔ زروہ نے کہا امی شمال نہ سہی جنوب کا ہی رخ کرلیں جہاں کبھی آپ کا میکہ ہوتا تھا اور آپ بھاگ بھاگ کر جایا کرتی تھیں اب وہاں آپ کی بیٹی مقیم ہے۔ بیٹی بھی واپس آ گئی تھی سو ہم عازم سفر ہوئے۔ پہاڑ اپنی جگہ اہم، مگر میدانوں کی اہمیت بھی تو مسلّم ہے۔

ہمارا چار کا ٹولہ دو اڑھائی گھنٹے کے سفر کے بعد جہانیاں پہنچا۔ ناشتے کے بعد مزنہ دوپہر کے کھانے میں مصروف ہوگئی اور میں خالہ ہاجرہ سے باتوں میں۔ اپنی امی کے بعد شاید یہ پہلا دورہ تھا جو نارمل حالات میں ہوا وگرنہ کتنی ہی شکلیں یاد آتی چلی گئیں.....ایک، دو، چار اللہ ہی جانے کتنی بار عزیز ہستیوں کے بچھڑنے پر جہانیاں کا چکر لگتا رہا یا پھر شادیوں پر..... دور جدید کی تبدیلیاں بھی عجیب ہیں۔ پہلے زمانے میں بارات ہفتہ بھر دلہن کے ہاں قیام وطعام کا لطف اٹھاتی تھی اب اپنے سگے بھی میرج ہال آتے ہیں اور وہیں سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ تو ہم بھی ایسی تین تقریبات میں آئے ضرور تھے، مگر میرج ہال کو ہاتھ لگانے۔

اگلا دن ملنے ملانے میں گزرا۔ رشدیٰ نے دوپہر کے کھانے پر سب کو مدعو کیا تھا وہاں سے پھر تعزیتی پروگرام بھگتا کے رات گئے مزنہ کے پاس پہنچے۔ اگلے دن واپسی تھی۔ اشتیاق صاحب تو لیاقت پور میں تھے جہاں ان کی آبائی زمینیں ہیں۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے اشتیاق صاحب کا ایک ہی شوق تھا۔ دو چھٹیاں اکٹھے آ گئیں یا ایک آگے پیچھے ملا کے زمینوں پر جا کے دل پشوری کرتے اور اتفاق یہ ہوا کہ معروف لکھاری فرزانہ چیمہ کا ان دنوں جب بھی فون آتا اشتیاق کی خیر خیریت پوچھنے پر پتہ چلتا کہ لیاقت پور میں پائے جاتے ہیں تو اس نے ان کا نام ہی لیاقت بھائی رکھ دیا۔

مومنہ (بڑی بیٹی) کا فون آیا ''امی ہم لوگ اسلام آباد سائڈ پر جا رہے ہیں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں کل علی الصبح روانگی ہے آپ جلد از جلد فیصل آباد آ جائیں''۔

اس کے اصرار کے سامنے میرے انکار کی کیا حیثیت تھی۔ جبکہ مومنہ کے ساتھ تائید کنندگان میں بچوں کے علاوہ سمدھیانے بھی شامل ہوں۔

داؤد میاں سات روزہ تربیت گاہ میں کہ جسے اب عرف عام میں ورکشاپ کہا جاتا ہے پہلے ہی اسلام آباد میں تھے۔ تو یوں ہنگامی حالت

میں پروفیسر صاحب کو راتوں رات جہانیاں آ کے مجھے اور زروہ کو فیصل آباد لے کر جانا پڑا۔ میری ایٹی نائن اور دونوں نائن زیرو یعنی نواسے نانی کو دیکھ کے خوش تھے۔نواسی دونوں چھوٹے بھائیوں کی نسبت زیادہ بھولی ہے، بچپنا اور معصومیت تو لازم وملزوم ہیں جو دونوں ہی آج کے بچوں میں ناپید ہیں۔ ہماری ایٹی نائن عائشہ مہد یہ پچھلے دنوں ہمارے پاس پورا ایک ماہ گزار کر گئی ہیں اور روز ہی بھولپن سے ایک شاہکار تخلیق کرتی رہیں۔

مجھے ڈاک میں ایصال ثواب کی جیبی سائز کی کتب کا پیکٹ موصول ہوا۔ بچوں کو ہر بات کی کرید ہوتی ہے جھٹ سے پوچھا، نانی! یہ کیا ہے؟ آسان الفاظ میں، میں نے اسے بتایا جیسے قرآن مجید میں دعائیں ہوتی ہیں یہ بھی دعائیں ہیں جو ہم اپنے فوت ہونے والے لوگوں کے لیے مانگتے ہیں۔

اگلی فرمائش حسب توقع تھی، نانی ایک لے لوں؟ پھر وہی نسوانی طریقہ.....ایک اور لے لوں بابا کی، ایک امی کی..... یوں دادا، دادی پھوپھو سمیت اس نے پانچ سات وصول کر کے اپنے بیگ میں رکھ لیں جو اکثر بیٹیوں کے دل میں اٹھنے والے سوال کا منہ بولتا ثبوت تھا، کہ بیٹیاں میکے ایک بیگ یا اٹیچی کیس لے کر جاتی ہیں تو سسرال واپسی پر وہ تین کیسے ہو جاتے ہیں۔

خیر فیصل آباد کی ایٹی نائن نے وہ جیبی سائز کی کتب اپنے باپ کے حوالے کرتے ہوئے تاریخی جملہ کہا۔

''بابا یہ میں نانی سے آپ کے لیے لے کے آئی ہوں قرآن مجید کی بیٹیاں ہیں یہ''۔

ایصال ثواب کی جیبی سائز کی کتب کو قرآن مجید کی بیٹیاں قرار دینے والی کسی ادیبہ کی نواسی یا پوتی ہی ہو سکتی ہے۔ یہ میرے میکے کی رائے تھی جسے سینے سے لگا کے ہمارا قافلہ عازم سفر ہوا۔ عائشہ نے ہی سفر کی دعا بآواز بلند پڑھی۔ بچوں کی ہلکی پھلکی شرارتوں اور بچوں کی دادی اور نانی کے مختلف موضوعات پر گفتگو میں خالی پیٹ نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور چکری انٹر چینج پر اتر کر مسجد کا رخ کیا۔ نماز کی تو سفر میں جمع بین الصلوٰۃ کی ربی سہولت موجود ہے جس سے فیض اور فائدہ اٹھانے میں الحمدللہ اس بندی ناچیز نے کمی نہیں چھوڑی۔ ''پہلے پیٹ پوجا تے فیر کم دوجا'' لہٰذا ہم نے بھی اول نمبر پر مومنہ کے ہاتھ کے بنے ہوئے سینڈوچز سے سلام دعا کرنے کے بعد ہی نماز ادا کی۔ گو کہ پہاڑ شروع ہو چکے تھے لیکن بڑے لوگ ان کا دیدار بار ہا کر چکے تھے۔ دونوں نواسے ابھی اتنے چھوٹے تھے کہ ان کے لیے دریا سمندر پہاڑ سب ایک جیسے ہیں۔ ہاں عائشہ مہد یہ بقائمی ہوش حواس پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھی۔ چونکہ پہاڑ ابھی سڑک کے پار بہت فاصلے پر تھے تو بیچاری بار بار نانی 'پہاڑ تو بہت پتلے ہیں' کا شکوہ کرتی رہی۔ پہاڑ بھی مرضی کے مالک تھے پتلے ہوتے ہوتے کبھی موٹے بھی ہو جاتے مگر اسی اثنا میں اسلام آباد شروع ہو گیا۔ سہولتوں، آسائشوں اور اونچے مراتب کا شہر.....خیر اب تو یہاں حکمران اور عوام الناس دونوں قسم کی مخلوق پائی جاتی ہے۔

اسلام آباد کے ایف الیون سے گزرتے ہوئے چند ہفتے قبل یہاں منتقل ہونے والی بھانجی عزہ یاد آ گئی۔ ایک یاد دل میں ہوتی ہے اور ایک بذریعہ میسج موبائل فون پر منتقل کر دی جاتی ہے، سو ہم نے بھی اسی سے کام لیا اور عزہ نے لوکیشن بھیج دی۔ لوکیشن کے آسرے پر ہم چند منٹوں کے اندر اس کی رہائش گاہ پر حاضر ہوئے تو دونوں اوپر بالکونی میں ہاتھ ہلا رہے تھے۔ ایک دن قبل باجی اور الطاف بھائی بھی اپنی صاحبزادی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ بس گھنٹہ ایک ہی ملاقات ہوئی۔ بچے تو آپس میں خوب گھل مل چکے تھے۔ اسلام آباد میں بھتیجی بھی رہتی ہے لیکن زبیر بھائی کے پے در پے آپریشنوں کی وجہ سے وہ لوگ اسلام آباد میں نہیں تھے۔ باجی اور میں زبیر بھائی کی خراب صحت کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ مومنہ اپنی خالہ زاد سے باتوں میں مصروف اور بچے آپس میں شیر وشکر تھے۔

چائے کے بعد مری کا پروگرام تھا۔ عین آخری لمحات میں باجی

نے بتایا کہ بشریٰ بھی مری آ چکی ہے ملتان سے۔ میں اس وقت تو کچھ جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ کا شکار تھی اس جملے پر غور نہ کر سکی پھر گھر سے نکلتے ہی گاڑی بھی ہاتھ کر گئی۔ اتنی سہولیات کے شہر میں ورکشاپ ڈھونڈنے میں چالیس منٹ صرف ہوئے۔ خدا خدا کر کے ورکشاپ مل ہی گئی تو پتہ چلا یہ ہماری گاڑی کے مرض کا علاج نہیں کر سکتی فلاں فلاں روڈ پر جائیں۔ گاڑی کو بمشکل گھسیٹ کر جب دوسرے روڈ پر پہنچے تو چالیس بیالیس منٹ گزر گئے۔ شکر الحمدللہ مرض کی تشخیص ہوگئی تھی تو علاج سے افاقہ ہوا۔

ایک مشہور و معروف بیکری کے سامنے سے گزرتے ہوئے باجی کا جملہ یاد آیا تو بشریٰ باجی کو میسج بھیجا۔ پیغام کا جواب فوری حاضر تھا بمعہ لوکیشن اور بھرپور دعوت کے۔ انہیں بتایا کہ میں اکیلی نہیں بلکہ مومنہ کی فیملی ساتھ ہے جسے پنجابی میں ''ٹبر'' کہا جاتا ہے۔ جواب آیا کوئی بات نہیں جگہ کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم نے بھی دعوت قبول کی، بیکری سے اشیائے خوردونوش لے کر مری کی موڑ وے پر گاڑی چڑھا دی۔

ہر چند کہ لوکیشن موجود تھی، گاڑی پر دیے گئے نقشے کی ہدایات بھی سامنے تھیں زروہ بھی نیٹ کھول کے لقمے دے رہی تھی پھر بھی ٹینشن تھی کہ خدا جانے کتنی گھمن گھیریوں کے بعد گھر ملے گا۔ گاڑی کی خرابی گھنٹہ پہلے ہی نگل چکی تھی۔ مری کی شروعات پر ہی مجاہد بھائی سے راہبری کے لیے رابطہ ہو چکا تھا۔ گاہے بگاہے وہ ہمیں راستے کے بارے میں دائیں بائیں اوپر نیچے کی روشنی میں گھر لے ہی گئے۔ مری کی اختتامی حدود میں ایک طرف صداقت کلینک دوسری طرف سی این جی تیسری طرف ہوٹل اور نیچے گلی میں گوشہ تسنیم۔ جب صہیب نے گاڑی گوشہِ تسنیم والی گلی میں ڈالی تو خوامخواہ ہی اقبال ''بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے'' کے ساتھ یاد آ گئے حالانکہ گلی میں خاصی رونق لگی ہوئی تھی اور گوشہ تسنیم پر جلی حروف میں ''العلم نور'' کے الفاظ روشنی پھیلا رہے تھے۔ شاید گاڑی نشیب میں لے جانے کا منظر میری نگاہوں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

بہر حال مجاہد بھائی کا مسکراتا سلام اور وسیع و عریض صاف ستھرا گھر دیکھتے ہی آدھی تھکن اڑن چھو ہوگئی۔ بلندی کے کچھ زینے چڑھ جانے کے بعد بالآخر بشریٰ باجی جھجھی ڈال کر ملنے کے لیے بازو پھیلائے نظر آئیں۔ جی بشریٰ تسنیم.....سماجی اصلاح کے لیے ہر ماہ بتول میں گوشہِ تسنیم کے عنوان سے کالم نویس.....میری پھوپھو زاد بہن جن سے محبت اور عقیدت کا رشتہ قائم تھا، دو دن بلکہ دو شب کی میزبانی سے دائم بھی ہو گیا۔ اسلام آباد میں موسم کافی گرم تھا جبکہ گوشہِ تسنیم میں کافی خنکی تھی جو بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر ہم دونوں (میری سمدھن حافظہ سکینہ طیبہ اور میں) بشریٰ باجی سے باہمی دلچسپی کے موضوعات پر تبادلہ خیال میں مصروف رہیں اور مومنہ اور زروہ بچوں کے ساتھ مغز ماری میں، یہاں تک کہ بھوک چمک اٹھی۔ پیٹ پوجا کے بعد گرما گرم چائے تو اچھی میزبانی کا لازمی حصہ ہے سو چائے کے بعد ہلکی پھلکی باتوں کا پھر دور چلا جس کا اختتام نیند اور بستر سے جڑا تھا۔

صبح ناشتے میں بشریٰ باجی کے ہاتھ کے خستہ پراٹھوں کے ساتھ انڈوں کا خاگینہ بھی موجود تھا۔ ہمارے جیسوں کے لیے جن کا معدہ کم ظرف ثابت ہوا ہے ڈبل روٹی اور سادہ یعنی سنگل روٹی بھی موجود تھی۔ ناشتہ کے اختتام پر یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ناشتہ زیادہ مزے کا تھا یا آپس میں گفتگو۔ مومنہ تو شاید ان سے پہلی مرتبہ ملاقات کر رہی تھی، اس کی ساس بھی بشریٰ باجی کی تحریروں کی فین ہی نہیں ائیر کولر نکلیں۔ مجاہد بھائی اور بشریٰ باجی کی پکار کہ آپ رات کو ہمارے ہاں ہی رکیے..... کے باوجود ہم بچوں کو تیار کر کے مری سے باہر نکل رہے تھے مگر جانا کہاں ہے کا فیصلہ ہمارے مردِ واحد، صہیب کو کرنا تھا۔ چوائس میں نتھیا گلی، ایوبیہ اور خانس پور تھے۔

ایوبیہ کا فیصلہ ہوا۔ لمبے لمبے درختوں اونچے پہاڑوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایوبیہ تک کا سفر مکمل ہوا۔ راستے میں چھوٹے دونوں نواسوں کی دلچسپی کا وافر سامان سڑکوں کے کنارے بیٹھے بندر تھے۔

بندر نظر آتے ہی بچوں کے چہروں پر مسکراہٹ آجاتی دانت نکل آتے اور ہاتھوں سے تالیاں بجاتے۔ بندروں کے چہروں پر بھی ایسے ہی تاثرات تھے بس فرق یہ تھا یہاں بندر آزاد تھے اور بندے گاڑی کے پنجرے میں۔ کوئی پاپ کارن کھا رہا ہے تو کوئی کیلا۔ ایک جگہ تو حرم مکہ والا منظر تھا۔ وہاں باجرہ کی تھیلی کبوتروں کے لیے ریال میں بکتی ہے یہاں بھٹوں والا ہاتھ کے اشارے سے گاڑی روک کر بولا، صاحب! ہم سے چھلی خرید کے بندروں کو ڈالو۔ ہم یہ سعادت نہ حاصل کر سکے اور پھر کچھ ہی دیر میں ایوبیہ آ گیا۔

مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے یہ صدر ایوب خان کے نام پر ہے۔ یقینی طور پر جغرافیائی معلومات میں پڑھ کے بتا سکوں گی لیکن اس کی خوبصورتی تو بہر حال مسلّم ہے۔

سڑک کے کنارے گاڑی اس شرط پر روکنے کی اجازت ملی کہ کھانا اسی ہوٹل سے (خرید کر) کھانا پڑے گا۔ ہم لوگ واش روم کی طرف چلے گئے اور صہیب کھانے کا آرڈر دینے۔ وضو کے بعد ہم بارہ بجے کے انتظار میں کرسیوں پر تشریف فرما ہو گئے۔ یہ سکھوں والے بارہ نہیں سورج کے زوال والے بارہ ہیں کہ جس کے بعد نماز کی ادائیگی کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ نماز کے لیے ادھر ادھر تانکا جھانکی کی تو ہوٹل کی نچلی عمارت یعنی تہہ خانے میں چند جائے نماز اور صفیں بچھی ہوئی نظر آئیں۔ تہہ خانے تک پہنچنے کے راستے میں کہکشاں نہیں سیڑھیاں تھیں۔ بس جیسے بڑے بڑے پتھروں کو کاٹ کر سیڑھیوں کی صورت دے دی ہو۔ پکڑنے کے لیے کوئی ریلنگ یا آسرا نہیں تھا اور ان کے درمیانی فاصلے میں اہلیان پنجاب آرام سے دو دو سیڑھیاں بنا سکتے ہیں مگر مرد کوہستانی کا ایک پاؤں سڑک کے ایک طرف اور دوسرا سڑک کے دوسری طرف بھی ہو تو چنداں حیرت کی بات نہ ہوگی۔ سو ہم ان سیڑھیوں کو پھلانگتے کودتے نیچے پہنچے۔ میں نماز کے بعد کمر سیدھی کرنے کو جو یقیناً کسی زمانے میں کمر ہی ہوگی مگر اب حدود اربعہ کے اضافے سے کمرہ بھی کہلائی جا سکتی ہے قالین پر لیٹ گئی۔

مجھے اس چار دیواری سے باہر پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک پچیس تیس سالہ نوجوان حالت اضطراب میں دکھائی دے رہا تھا جو جلے پاؤں کی بلی کی طرح دائیں سے بائیں تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ مومنہ کی نماز مکمل ہونے پر جب ہماری لین ڈوری سیڑھیوں سے واپس اوپر کی طرف جا رہی تھی تو میں نے پلٹ کر اس نوجوان کی طرف دیکھا جو تیزی سے لپک کر مسجد میں گھسا اور یوں بے قراری سے گیا کہ اس کے تکبیر کے لیے اٹھے ہاتھ دیکھ کر اس سے زیادہ میری بے قراری کو قرار آ گیا۔ میرے دل سے اس کی صالحیت برقرار رہنے کی دعا نکل رہی تھی۔ آنکھیں ایسے مناظر دیکھ کر ویسے ہی چھلکنے کو بے تاب ہو جاتی ہیں۔ کچھ پھل پانی کی بوتل اور کندھے پر لٹکانے والے بیگ کے ساتھ ہم نے چیئر لفٹ کا رخ کیا۔ چیئر لفٹ تک پہنچنے کے لیے بلا مبالغہ سترہ کا ردشوار درپیش تھے۔ سیڑھیاں در سیڑھیاں..... وہ بھی تینوں فیڈر پیتے بچوں کے ساتھ..... اس کے بعد ٹکٹ خریدنا، جو اگرچہ صہیب نے پہلے ہی لے لی تھی۔ سانپ اور سیڑھی کی طرح بل کھاتی لمبی..... لمبی کو جتنا مرضی لمبا کر لیں..... قطار تھی عاشقان کی جو چیئر لفٹ کے لیے دھوپ میں منتظر تھے۔

میں عادت سے مجبور اللہ کی رنگ برنگی مخلوق کے جائزے میں مصروف تھی۔ اب میری نظروں کے حصار میں چار کا ٹولہ تھا، دبلے لمبے کالی جینز اور کالے ماسک میں دولڑکے، گرے جینز اور گلابی شرٹ میں نک سک سے تیار قیمتی ہتھیاروں یعنی مہنگے کیمرے اس سے بھی مہنگے موبائل فون کے ساتھ دولڑکیاں جن کی اوپر کی طرف اٹھی پونی سے ذہن خوامخواہ ان کے غیر ملکی ہونے کی طرف منتقل ہو رہا تھا، اوپر سے اس کی تصدیق ان کی آپس میں فراٹے دار ''گوڑھی'' انگریزی کر رہی تھی۔ جب لائن میں حالت انتظار میں کھڑے ان فارن جوڑوں کو (بہن کا بھائی سے بھی جوڑا ہی ہوتا ہے!) پچیس تیس منٹ گزرے، دھوپ تیز ہوگئی، ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ مانگا تو ایک لڑکی نے اردو میں جواب دیا اور جب مزید دس بارہ منٹ گزرے تو اردو سے پنجابی میں بھی گفتگو شروع ہو چکی تھی۔

قدرت بھی کیا کیا رنگ دکھاتی ہے!

چیئر لفٹ پر بیٹھنے کے لیے ہر دو منٹ کے بعد بلیٹن جاری ہوتا ہے.....امی بہت ہوشیاری سے بیٹھنا ہے، امی گھبرانا نہیں وغیرہ وغیرہ.....خیر بی بی لفٹ تشریف لائیں، میں زروہ اور تین سالہ سلمان، چڑھ جا لفٹ پہ خدا بھلی کرے گا' کے محاورے پر عمل پیرا ہوئے۔ اف چیئر لفٹ تھی یا منٹھار کی کھڑ کھڑ کرتی بس جو جھٹکوں کے ساتھ محو پرواز تھی۔ موت سے کیا ڈرنا وہ تو جہاں لکھی ہے آ کر ہی رہے گی۔ ٹینشن تو یہ تھی کہ اتنی پھٹیچر اور شور شرابے والی لفٹ بالفرض سفر آخرت پر روانہ کر دے تو وہ سفر، سفر سعادت ہوگا یا شہادت..... نیچے مناظر بلا شک وشبہ بہت اچھے تھے پہاڑ، ہریالی..... نیچے پاٹ دار آواز میں کوئی بچہ بلبل صحرا بننے کو نعت پڑھ رہا تھا۔ وہ بلند و بالا چوٹی پر نعت ''محمدؐ کے غلاموں کا کفن میلا نہیں ہوتا'' پڑھنے میں مصروف تھا۔ جب چیئر لفٹ اس کے سر پر سے گزرتی تو سواری حسب توفیق کچھ نذرانہ نیچے پھینکتی جسے وہ کمال مہارت سے تھام لیتا۔ خدا نے بندے کی روزی روٹی کمانے کے بھی کیا کیا ڈھنگ بنائے ہیں۔

چیئر لفٹ نے جس سٹاپ پر اتارا وہاں گھڑ سواری کے لیے گھوڑا، نشانہ بازی کے لیے گن اور غبارے، اور جسے حضرت علامہ اقبال سے عقیدت ہو اس کے لیے پاؤں رسی سے بندھا عقاب کا بچہ موجود تھا۔ بچوں نے خوب مزے کیے کبھی اوپر کبھی نیچے.....چاروں طرف لوگ یوں خوش گپیوں اور کھانے پینے کے شغل میں منہمک تھے کہ لگتا ہی نہیں تھا یہاں کرونا وائرس نام کی کوئی بلا کئی گھروں میں زندگی کے رنگ پھیکے کر چکی ہے۔ بچوں کے لیے جھولے اور دس طرح کے تفریح کے سامان موجود تھے۔ لذت کام و دہن کے بعد واپسی کا سفر شروع ہوا۔ اب کے ہمارا شریک سفر دو سالہ موسیٰ تھا جو اڑتے کوؤں کو دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ بالآخر چیئر لفٹ کا پہلا اور آخری مرحلہ اختتام پذیر ہوا۔ چیئر لفٹ سے اترنا کوئی آسان کام نہیں اچھے اچھوں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ ام صہیب یعنی مومنہ کی ساس امی چیئر لفٹ میں ہم سفر نہیں تھی تو انہیں ڈھونڈ کے واپس ہوٹل میں پہنچے۔

کھانا مزے کا تھا۔ ٹیبل کے پرے جنگل اور پہاڑی کوؤں کا شور، بہت گھنا جنگل تھا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا، یوں عصر سے پہلے ہی نتھیا گلی، گلیات جھیکا گلی اور خدا جانے کن کن راستوں سے واپس مال روڈ مری پہنچے تو مغرب میں کافی دیر تھی۔ مال روڈ مری جس کی وجہ شہرت جوڑے ہیں جو وہاں پائے جاتے ہیں، نئے پرانے کی کوئی شرط نہیں..... ''چھڑوں'' کے دیکھنے کو بھی یہاں وافر سامان موجود ہے۔ مال روڈ پر چھوٹی بڑی دکانوں میں جھانک کر دیکھا تو ''نکّو نک'' چائنا کے سامان سے بھری پڑی تھیں۔ دس روپے سے دس ہزار کی مالیت کی اشیائے ضرورت، چائنا کا سامان تو گوجرہ سے بھی ملتا ہے کیا فائدہ بوجھ اٹھانے کا، میں نے زروہ کو تنبیہہ کی۔ بچوں نے خوب رونا پیٹنا ڈالا ہوا تھا قابو نہیں آ رہے تھے تو بچوں کی دادی اور نانی وہاں پر رکھے بنچ پر بیٹھ گئیں۔ گفتگو کے لیے ہر دو کے پاس موضوعات کا بھاری بھرکم سٹاک موجود رہتا ہے اس وقت بھی ہم باہم تبادلہ خیال میں مصروف تھیں۔ راہ چلتے لوگ اپنے تئیں ''ترقی یافتہ'' کہلوانے کے شوق میں تیتروں میں شامل تھے نہ بٹیروں میں۔ سب کے ہاتھ میں موبائل، سیلفی لینے میں مصروف، دنیا یا دنیا کوئی مسئلہ اس وقت کیا ہو رہا ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ سب عجیب بے ہنگم طریقے سے سیلفیاں بنا رہے ہیں، تصویریں کھینچ رہے ہیں۔ ہاو ہو کا شور! ہاتھ سے کھینچنے والی گاڑی میں بیک وقت کئی کئی بچے اور عورتیں سو روپے کے عوض انسان پر بوجھ بنی ہوئی تھیں۔ میں اس کے خلاف نہیں مگر آپ کا کیا خیال ہے کہ پہاڑوں کے رہنے والے ان ہاتھوں سے کھینچنے والی گاڑیوں میں کئی کئی عورتوں کو کھینچتے ہیں تو ان کو یہ کام آسان لگتا ہوگا؟ برا حال، بیچارے روزی روٹی کی خاطر کھینچ رہے تھے اور ایک گاڑی کھینچنے والا ستر بہتر سالہ بزرگ تھا اور جن کو بٹھا کر لے جا رہا تھا وہ موٹاتیں بتیس سالہ جوان! انسان تو غربت کے ہاتھوں مجبور ہے جیسے بھی ملے دو وقت کی روٹی

کا سامان کرنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلتا ہے۔ یہ دلیل کہ وہ پہاڑی علاقوں کے باسی ہیں مرد کوہستانی ہیں انتہائی بودی ہے۔ کیا میدانی علاقوں میں رہنے والے ستر اسی سالہ بزرگوں کو سڑکوں پر پانچ من کا وزن لاد دیں تو وہ آسانی سے اٹھالیں گے؟ ظاہر ہے نہیں۔

ابھی اسی غم کوہستانی میں غرق تھی کہ ایک پاٹ دار آواز سنائی دی ''رب دے ناں دا صدقہ خیرات دو'' آنکھ اٹھا کر دیکھا تو وہ مخلوق جس کے لیے کچھ لکھنے سے پہلے دس مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔ جی جی ٹرانس جینڈر.....اس کی کیا آمد ہوئی ہر دو منٹ کے بعد ایک نہ ایک سر پر سوار ہو جاتا۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ پانچ منٹ میں پانچ آ گئے۔ مال روڈ تو بنی ہی ہلے گلے کے لیے ہے پھر یہ موقع کیوں چھوڑتے۔ میں نے نوٹ کیا جن میں نسوانیت زیادہ تھی وہ مردوں کے اردگرد گھوم رہی تھیں اور جس میں مردانگی کا چھینٹا تھا وہ لپک لپک کے عورتوں کی طرف جاتا۔ لوگ ان کے ساتھ گروپ فوٹو لے رہے ہیں سیلفیاں بن رہی ہیں۔ جو صدقہ دے چکے وہ اب تماش بینوں میں شامل ہیں اور جو صدقہ دینے میں حیل و حجت سے کام لے رہے ہیں ان کا اس مخلوق نے تماشہ بنایا ہوا ہے۔

ایک لڑکی نما کو میرے نواسوں کی دادی اماں نے انٹرویو کے لیے گھیر لیا۔ سچ تھا یا جھوٹ واللہ عالم لیکن بقول اس کے ہم سب سرگودھا سے ہیں اور مال روڈ پر ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے۔ ایک گروہ کی واپسی ہے اور دوسرا گروہ آ جائے گا۔ اس سوال پر کہ سرگودھا میں کیا آپ کی روزی روٹی نہیں تھی؟ ارشاد فرمایا وہاں ہمارے گرو جی نہیں دہاڑی لگانے دیتے تو مجبوری میں یہاں آنا پڑا" جتھے روزی لکھی ہے تے او تھے آ اپڑاں گے۔

بنچ پر بیٹھ کے مال روڈیوں کے نظارے کو بیس بائیس منٹ گزر گئے تو ہم نے سوچا کچھ مزید مٹرگشت کی جائے۔ بندو خان سے پچاس قدم آگے گرم شالوں کی دکان نظر آئی۔ بے شک شالیں بہت خوبصورت تھیں، سات آٹھ سو سے ہزاروں تک کی مالیت کی لیکن اس وقت میرا بارگیننگ کا بالکل حوصلہ نہیں تھا۔ بچوں نے شاید تھکاوٹ سے یا بھوک سے پنجم سر میں باجا بجانا شروع کر دیا تھا ایسے میں حواسوں پر بچے سوار تھے۔ ویسے بھی مومنہ کی ساس امی نے ایک نیٹ کی شرٹ پسند کی جو دکاندار کے مطابق پندرہ سو روپے فکس پرائز پر ملے گی، انہوں نے کہا میری بیٹی تو یہ ہزار روپے کی لے کر گئی ہے آپ سے تو دکاندار نے کہا! کوئی بات نہیں باجی آپ کے لیے بھی ہزار روپیہ!

اس پر مجھے ہمیشہ ایک بچپن میں پڑھا لطیفہ یاد آ جاتا ہے ایک دکاندار نے نیا سیلز مین رکھا۔ گاہک نے کوئی چیز خریدی قیمت نو سو روپے تھی۔ دکاندار آیا تو اسے فخریہ بتایا کہ میں نے گاہک کو یہ نو سو روپے میں بیچ دی ہے۔ دکاندار نے سر پر ہاتھ مار کے کہا تیرا بیڑہ غرق تو ایک صفر کھا گیا یہ تو نو ہزار روپے کی ہے۔ خیر نقصان تو اب بھی نہیں ہوا سو روپیہ تو اب بھی نفع مل رہا ہے آئندہ دھیان رکھنا۔ اس لطیفہ میں کچھ نہ کچھ حقیقت تو مری روڈ کی شالوں پر دکھائی دے رہی تھی۔ ویسے بھی زندگی گزارنے کے بعد اب یہ ہنر ہاتھ آیا کہ کسی چیز کی قیمت نہیں جانتے تو مت خریدو۔ سستی لے لی تو صدمہ ہوگا ایک اور لے لیتے، مہنگے داموں خرید لی تو دکھ پر دکھ..... یہ میرا ذاتی قول ہے، جس کی روشنی میں کچھ نہ لینا ہی مناسب تھا۔

مال روڈ پر ہی تھے کہ بشریٰ باجی کا میسج اور پھر فون کال موصول ہوئی، کھانا تیار ہے بس روٹی آنے پر منگوالی جائے گی یا بنائی جائے گی، بس اب جلدی سے آ جاؤ۔ سو یہ قافلہ پھر گوشہ تسنیم جا پہنچا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ہوٹل اور گھر کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ بچے بھی خوشی سے سیڑھیاں پھلانگتے اوپر پہنچے۔ چونکہ ایوبیہ میں پیٹ بھر کے کھانا کھالیا تھا اس لیے کھانے کی قطعی بھوک نہ تھی۔ باتوں کی چاہ تھی سو باتوں سے باتیں نکلتی گئیں۔ مومنہ کی ساس، میں، مومنہ، اور زروہ سب کی اچھی مجلس رہی۔ موٹروے سانحہ سے لے کے بہت سے امور زیر بحث رہے تا آنکہ مردانہ پارٹی کو بھوک لگ گئی۔ بشریٰ باجی کے ہاتھ کے کھانوں کے بعد چائے اور پھر نندیا پور.....سب ایک ایک کر کے سو گئے، بشریٰ باجی نے کہا

ہم آج جانے والوں کو یاد کریں گے۔ جانے والوں میں ہمارا مشترکہ دکھ اماں جی کا ہے، میری دادی اور ان کی نانی۔ بہت دیر ہم ان کی باتیں کرتے رہے۔ پھر کچھ ادبی قسم کے مسائل، کچھ خاندانی مسائل پر گفتگو میں بارہ بج گئے۔ میری چاہت شب بیداری کی تھی مگر ناسازی طبیعت کی وجہ سے بارہ بجے سونے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔ اگلی صبح ناشتے کے بعد واپسی تھی۔ صہیب کی بھی مجاہد بھائی سے خوب دوستی ہوگئی تھی اس کا اندازہ مجھے ان کی گفتگو سے ہوا۔ سامان گاڑی میں رکھنے سے پہلے میں نے ان کے گھر کے پچھواڑے میں گھنا جنگل دیکھا، اردگرد کے مناظر آنکھوں میں محفوظ کیے۔

اچھی یادیں لیے رخصت ہوئے تو امیرِ سفر نے گاڑی کا رخ لارنس کالج کے بورڈنگ کی بیک سائڈ میں واقع وائلڈ لائف پارک کی طرف کر دیا۔ اف ویرانے میں کیا زبردست پارک مگر حاضرین و ناظرین نہ ہونے کے برابر۔ بس دو فیملیز اور تھیں۔ بچے مزے سے چیتا، اصلی شیر اور شتر مرغ دیکھ کے خوش ہوئے۔ ہم دونوں نے بنچ کو وقتی طور پر مسکن بنایا۔ بچے واپس آئے تو گھوڑا گلی سے گزرے۔ اب یہ خدا جانے کون سی سائڈ تھی مگر تھی تو گھوڑا گلی..... یہ اور بات ہے کہ گھوڑا نام کو نہیں تھا، ہاں گائے اور مقدس گائے دونوں راؤنڈ پر تھیں۔

مری کے بلند پہاڑوں کو خدا حافظ کہتے جب پیر سوہاوہ پر واقع مونال ہوٹل پہنچے تو بیس مرتبہ موڑ کاٹتے ہوئے خود بھی گھومے۔ دل دھک دھک..... دل دھک دھک..... بس مونال پہنچ گئی تو قرار آیا۔ گھومنے پھرنے سے بھوک بھی تھی، کھانا منگوایا خوبصورت اور حسین مناظر کی اوٹ میں کھانا کھایا۔ کھانا جتنے مزے کا تھا بل اس سے بھی زیادہ۔ روٹی ایک پچھتر روپے کی، منرل واٹر کی بوتل ڈیڑھ سو روپے کی، خیر سارا اسلام آباد ہمارے قدموں تلے تھا تو اس کی اتنی قیمت تو بنتی تھی۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں!

مونال سے ہم نے گاڑی کو بریک دامن کوہ میں لگوایا۔ اوہ میرے خدایا بندر ہی بندر..... اوپر درختوں پر دائیں بائیں آگے پیچھے یہاں تک کہ ہماری ٹانگوں میں سے گزرتے..... خوخو کرتے..... بچے تو بس بندروں کے شیدائی ہوگئے بالخصوص چھوٹا موسیٰ بندروں کے پیچھے بھاگتا دوڑتا اور بھگا دیتا۔ بچوں کی خوشی سے چہکتی آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی تھیں۔ بابا مونگی..... ماما مونگی نانی مونگی۔ ہی ہی ہی۔

بچوں کے جوش اور ولولے کو دیکھ کر افسوس ہوا دامن کوہ میں ہی سیدھے آجاتے۔ دامن کوہ تو کیا بندروں کا دیس تھا اچھا خاصا.....سو روپے کے عوض بندر نے بچوں کو ٹھیک ٹھاک تماشا بھی دکھایا۔ بندروں کو اتنا قریب سے دیکھ کے صرف بنی اسرائیل ہی یاد نہیں آئے بلکہ انکل ڈارون بھی بے تحاشا یاد آئے۔ آخر کچھ تو ہوگا کہ بندر سے رشتہ جوڑ بیٹھے۔ بچوں کی افسردگی دیدنی تھی۔ دامن کوہ سے نکلتے ہوئے سینٹورس شاپنگ مال میں نماز عصر کی ادائیگی، اوپر نیچے کے سارے فلورز پر چہل قدمی کے بعد مغرب کے وقت فیصل آباد روانہ ہوئے تو ذہن میں پچھلے سال کے سارے سوال اودھم کود مچا رہے تھے۔ کوہستانیوں کی زندگی بلاشبہ سخت ہے۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

میدانی تو بس گرمی سردی زیادہ ہوجائے تو مرنے والے ہوجاتے ہیں۔ میرے دل میں گزشتہ سال کی طرح سوال کنڈلی مارے بیٹھا تھا، ان پہاڑیوں میں رہنے والوں کی اصل زندگی ان کا رہن سہن کیسا ہوتا ہے، ان کی غمی خوشی کیسے ہوتی ہے ان کے رسم و رواج کیسے ہیں ان کے گھروں کے نقشے کیسے ہوتے ہیں ان کا معاشرتی رہن سہن کیسا ہوتا ہے۔ یہ مال روڈ کی چکا چوند، یہ ایوبیہ کی چیئر لفٹ تو ان کے کلچر کی عکاسی نہیں کرتے اور.....اور پہاڑوں کے درمیان رہنے والوں کی گلیاں محلے تو ہوتے نہیں۔ ٹانویں ٹانویں گھر..... بھلا ڈاک کا ایڈریس کیسے ہوتا ہوگا.....اور کوئی یہ تو بتائے کہ ان کے ہاں قبریں کیسے کھودی جاتی ہیں۔

جن کے ہاں گرم پانی کا بندوست نہیں وہ مُردوں یعنی میت کو غسل کیسے دیتے ہوں گے؟

ان سوالات کے جوابات کے لیے ایک دن نہیں ہفتہ بھی کم ہے۔ باقی رہے حسین مناظر، تو حسن تو دامن دل کھینچتا ہے مگر مجھے دنیا کا حسین سے حسین مقام دیکھ کے کم محسوس ہوتا ہے۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ سب سے زیادہ حسن تو جنت میں ہوگا یہاں کے پہاڑوں کا حسن اپنی جگہ مگر گندگی سے بہت دل خراب ہوا۔ جنت تو دل خوش کن جگہ کا نام ہے ہر شے مسافر ہر چیز راہی۔ منزل تو اللہ کی ذات بابرکت جنت کو بنا دے تو اصل سفر نامہ لکھنے کا مزہ دوبالا ہو جائے گا۔ بچے بوڑھے ایک برابر کہنے والوں نے درست ہی کہا۔ بچے بھی لوٹ پوٹ کے زندگی کے ہنگامے کے لیے تیار اور ہم بوڑھے بھی۔

باقی رہنے والی ذات اللہ نے کہا ''سیروفی الارض''۔

☆.....☆.....☆

تیسری قسط

ڈاکٹر ثمین ذکا

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر

سکاٹ لینڈ سے واپسی

جنوری 1978ء کے آخر میں واپسی کا فیصلہ ہؤا اور یہ ضروری تھا کہ اپریل تک لاہور پہنچیں تاکہ گرمیوں کی چھٹیوں سے پہلے بچوں کے سکول میں داخلے ہو جائیں۔

تمام ضروری کاغذات مجھے اس بریف کیس سے مل گئے جس کی نشاندہی ڈاکٹر ذکا مرحوم نے کچھ عرصہ پہلے کی تھی۔ جس ایڈووکیٹ کے ذریعہ گھر خریدا تھا اس کے ذریعہ بیچنے کو لگا دیا۔

اتفاق سے ڈاکٹر ذکا کی پنشن بھی زیادہ مقرر ہوئی کیونکہ انہوں نے پنشن کی قسط زیادہ کٹوانی شروع کر دی تھی جب سے معلوم ہؤا کہ دل کی حالت اچھی نہیں ہے۔ شہر کے سب پاکستانیوں نے ہر معاملہ میں بے حد مدد دی۔

لاہور سے میری بہن آصفہ سلیم کو بڑی بہن ڈاکٹر تنویر نعیم کے مشورہ سے میرے پاس بھیجا گیا تاکہ ہمیں ساتھ لے کر پاکستان آئیں۔ یہ بھی بہت بڑی امداد تھی۔ حیرت ہو رہی تھی قادرِ مطلق کے لیے قدم قدم پر اپنی خصوصی مدد بھیج رہا تھا۔ اکثر رات کو سورہ فاتحہ کا وظیفہ توجہ سے پڑھتی تاکہ مسلسل ذاتِ باری تعالیٰ رہنمائی فرماتے رہیں۔

چند ماہ پیشتر ہی جاپان سے گاڑی منگائی تھی اور کہتے تھے ''اس ملک میں رہنے کو دل نہیں کرتا تھوڑی طبیعت بہتر ہو جائے تو اپنے وطن ہی جائیں گے''۔

سکاٹ لینڈ کے گھر میں آخری دن!

گھر بک چکا تھا آخری روز مقررہ وقت پر صبح دس بجے وہ لوگ چابی لینے آ گئے تھے۔

ہم نے دوپہر تک بھائی آصف کے گھر جانا تھا۔ عصر کی نماز وہیں ادا کرنے کا پروگرام تھا۔ قریب کے علاقہ میں ایک کاروباری خاندان کے پاس بڑی وین تھی انھوں نے ہمیں سامان سمیت بھائی کے ہاں لے جانا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ بجے ان کا پریشانی کا فون آ گیا۔

''گاڑی خراب ہے ورکشاپ پہنچا دی ہے۔ ہم شرمندہ ہیں''۔

''کوئی بات نہیں کچھ اور بندوبست ہو جائے گا''۔ میں نے کہا۔

دو بڑے کریٹ بستر اور بچوں کی چیزوں سے بھرے ہوئے کسی عام گاڑی میں پورے نہیں آ سکتے تھے۔ میری بہن مسز آصفہ سلیم سارا وقت میرے ساتھ مدد کراتی رہی تھیں وہ بھی کچھ پریشان ہو گئیں کہ اب کیا ہوگا؟

پورے گھر میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ سامان تو کچھ اللہ واسطے دے دیا کچھ بیچ دیا تھا۔ ہم لوگ ہال کی سیڑھیوں پر بیٹھے دل ہی دل میں اللہ سے مدد کے لیے دعا کر رہے تھے۔ چونکہ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس کو فون کریں۔

تقریباً تین بجے بھائی آصف کا فون آیا۔ ''میں معلوم کرنا چاہتا تھا آپ روانہ ہوئے یا نہیں؟''

میں نے انھیں مختصر اپنی پریشانی بتائی۔ وہ بولے ''میں ابھی اسلامک مشن کے بھائیوں سے رابطہ کرتا ہوں بلکہ بھائی خورشید اور بھائی اعظم نے آج صبح ہی مدد کی پیشکش کی تھی مگر ہمیں ضرورت نہ تھی''۔

تقریباً پون گھنٹہ بعد ہمارے گیٹ کے اندر ایک بڑی وین پہنچ گئی۔ آگے دو برادران تشریف فرما تھے۔ اس نے دونوں حضرات کی راہنمائی کر دی جلدی سے سامان پیچھے رکھ دیا گیا اور ہم چاروں درمیان کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹہ میں ہم بھائی آصف اور بھابھی سمن کے ہاں پہنچ چکے تھے۔ اس وقت ان کی ایک ہی بچی زینب تھی۔

اگلے روز ہماری لندن کے لیے فلائیٹ تھی۔ وہاں ڈاکٹر ذکاء کے بچپن کے دوست بھائی جاوید قیوم ایئرپورٹ لینے آئے تھے ان کی بیگم عائشہ نے دو روز ہماری بہت دیکھ بھال اور خاطر مدارت کی اور تیسرے روز کراچی کے لیے روانہ ہوئے۔

اللہ کی مدد اور عزیزوں کی ہمدردیاں یاد آتی ہیں تو دل شکر کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے۔

جو قسمت میں لکھا ہو مل کر رہتا ہے

مرچنٹ نیوی کے ایک کیپٹن کا ڈاکٹر ذکاء نے سال پہلے علاج کیا تھا اور وہ صحت یاب ہو کر اپنی نوکری پر بحال ہو گئے تھے۔ جب کیپٹن صاحب کو اطلاع ملی تو ہمیں تاکید کی بڑا سامان جیسے بستر اور بچوں کی بڑی بڑی کھیلنے کی چیزیں بھائی آصف مجید کے گھر چھوڑ جائیں وہ اپنے جہاز پر لے آئیں گے۔ اتفاق سے کاغذات مکمل نہ تھے اس لیے کراچی پورٹ پر ہمارا سامان نہیں اُتر سکتا تھا۔ اسی طرح دو سال جہاز میں رہا پھر کسی طریقہ پر کیپٹن صاحب نے نکلوا لیا اور لاہور پہنچایا۔ بالکل صحیح صالم 12/13 تو اصلی اون کے کمبل ہی تھے اور بچے اپنی چیزیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

اللہ کے فضل و کرم سے انہیں دنوں ہم اپنے گھر شفٹ ہوئے تھے۔ لاہور میں بچوں کے سکول میں داخلے ہو گئے۔ بڑی بہن کے بچے بھی اسی سکول جاتے تھے اس لیے آسانی ہو گئی۔ دو سال ہم انہیں کے مہمان رہے۔ پہلا سال سب سے مشکل تھا۔ میرا دماغ صحیح طرح کام نہ کرتا تھا اور دل بھی ٹھیک نہ تھا۔ ڈاکٹر نبیہہ حسن نے دوائی دی ہوئی تھی۔ جو بھی عزیز رشتہ دار افسوس کرنے آتے میرے آنسو ہی بہتے رہتے۔ یہ تو معلوم تھا صبر آئے گا مگر کب اور کیسے؟ قرآن پڑھنا اور اچھی دینی کتب اور سیرت کے بارہ میں مختلف کتابیں یہی میری مصروفیت تھی۔

باجی ہاشمی حیات تھیں انہوں نے دل کے سکون کے لیے سورہ الم نشرح گیارہ مرتبہ عصر کے بعد پڑھنے کو کہا اول آخر درود شریف۔ یہ روحانی نسخہ بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔

ترجمہ: ''کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ نہیں کر دیا، اور ہم نے آپ پر سے آپ کا وہ بوجھ اُتار دیا۔ جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی، اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا ذکر بلند کیا۔ سو بے شک سختی کے ساتھ آسانی ہے بیشک مشکلات کے ساتھ آسانی ہونے والی ہے۔ تو جب آپ فارغ ہو جایا کریں (فرائض سے) تو دوسری عبادات میں محنت کیجیے اور اس میں اپنے رب کی طرف ہی توجہ رکھیں''۔

ایک روز سید عبدالقادر جیلانی کی کتاب الفتح الربانی فیوضی یزدانی پڑھ رہی تھی اس میں ایک جمعہ کا خطبہ ایمان پر تھا اور لکھا تھا بندے کے دل میں اگر کیوں آئے تو اس کا مطلب ہے ایمان نامکمل ہے۔ آگے علاج نہ لکھا تھا۔ باجی ہاشمی سے کہا میرے دل میں کئی بار یہ خیال آتا ہے کیوں اتنی جلدی فوت ہو گئے تھوڑے سال اور مل جاتے؟ تو انہوں نے کہا پہلا کلمہ کثرت سے پڑھو بلکہ ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھ لیا کرو۔ میں نے یہی کیا اور چند روز میں دل مطمئن ہو گیا۔

بیٹی تو جلدی سیٹ ہو گئی مگر اویس بیٹے کو تھوڑا وقت لگا۔ کئی ایک جاننے والوں نے کہا ''اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے باپ بھی گیا اور جگہ میں بھی اتنی بڑی تبدیلی'' مگر مجھے یقین تھا اللہ تعالیٰ اس کو بھی سیٹ کر دیں گے اور یہی ہوا۔ دو سال بعد ہم نے اسی علاقہ میں اپنا گھر لے لیا تو اویس بیٹا جلد سیٹ ہو گیا۔ قریبی رشتہ داروں اور بڑی بہن کے سسرال نے جو بالکل قریب رہتے ہیں بچوں کا بہت خیال کیا اللہ تعالیٰ انہیں بہترین اجر سے نوازے آمین۔

اب اللہ کے فضل سے میری صحت بہت بہتر تھی کسی حد تک صبر بھی آ گیا تھا اس لیے سروس کرنے کا موڈ ہو گیا ایک ڈاکٹر سہیلی کے ذریعہ بہت اچھی سروس مل گئی مگر جب گرمی شروع ہوئی تو چکر آنے لگے اس لیے کام چھوڑنا پڑا۔

گھر میں رہتے چند دن ہوئے تھے کہ دل میں پھر سے 'کیوں' آ گیا اور شیطان نے علاج بھلا دیا۔ بچوں کی پھوپھی کے ہاں ایک روحانی بزرگ آئے۔ ہم تینوں کو انہوں نے دعائیں بتائیں اور 'کیوں' کا علاج پہلا کلمہ طیبہ ہی بتایا۔ اب دل میں اس کلمہ کی اہمیت اتنی گہری نقش ہو گئی کہ کبھی بھولنے والی نہیں انشاء اللہ تعالیٰ۔ یہی تو وہ الفاظ ہیں جب دل

میں اُترتے ہیں تو ایمان یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے اور مسلمان کو اللہ کی رضا میں راضی ہونا آتا ہے۔

درسِ قرآن کا سلسلہ

بہت اچھی بات یہ ہوئی کہ مسز رفعت حنیف (بنت الاسلام) نے ریٹائرمنٹ کے بعد ہفتہ وار درس شروع کر دیا۔ ویسے بھی وہ مجھے بہت پسند تھیں جب بھی طبیعت اداس ہوتی انہیں فون کرتی تو وہ بلا لیتیں اور بہت اچھی اچھی باتیں بتاتیں۔ ایک مرتبہ مناجات مقبول (مولانا اشرف علی تھانوی) تحفہ دی اور کہا ''ان دعاؤں کو زندگی میں بہت مفید پایا'' ہفتے کے سات دنوں کی دعائیں قرآن اور حدیث سے ایک جگہ اکٹھی کی ہوئی ہیں''۔

آپا جی بنت الاسلام کے درسِ قرآن میں بہت لطف آتا تھا۔ وہ ہمارے بڑے بہنوئی ڈاکٹر نعیم اقبال کی سب سے بڑی ہمشیرہ تھیں۔ قلمی نام بنت الاسلام والد نے رفعت اور والدہ نے نسیم آرا نام رکھا تھا۔ لاہور کالج فار وومن میں اسلامیات کی ہیڈ ریٹائر ہوئیں۔ بہت سال بتول رسالہ کی ایڈیٹر رہیں۔

چالیس منٹ قرآن پڑھتے بیس منٹ حدیث اور دس منٹ میں دعا سے پہلے دو قسم کی تسبیحات پڑھتے۔ وہ نہایت مخلص اور باعمل خاتون تھیں دعا کے بعد جن کے کچھ مسائل ہوتے وہ خواتین ان سے مشورہ بھی کرتیں۔

کبھی کبھی تقسیم ہند کے واقعات اور اپنے بچپن کے حالات بھی بتاتی تھیں ایک مرتبہ انہوں نے بڑا دلچسپ خواب سنایا۔ یہ خواب آپا جی نے اپنے والد مولانا ظفر اقبال سے سنا۔ مولانا اصغر علی روحی اسلامیہ کالج میں اسلامیات کے پروفیسر تھے، اور مولانا ظفر اقبال صاحب سے کافی دوستی تھی جو کہ اس زمانہ میں کیمبل پور (اٹک) کالج میں پرنسپل تھے۔ آپا جی کے والد صاحب نہایت بلند پایہ باعمل عالم دین تھے۔

پاکستان کو وجود میں آئے تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا۔ مولانا روحی نے ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہیں آپ کے ایک طرف صحابۂ کرام تشریف رکھتے ہیں اور دوسری طرف قائداعظم محمد علی جناح آپ کے بالکل قریب بیٹھے ہیں۔ خواب ہی میں مولانا روحی پوچھتے ہیں یہ آپ کے اتنے قریب بیٹھے ہیں؟ تو آپ ﷺ جواب فرماتے ہیں ''ہاں یہ وہ شخص ہے جس نے میری امت کو اکٹھا کیا''! اس زمانہ میں کچھ مولوی لوگ قائداعظم کی داڑھی نہ ہونے کی وجہ سے باتیں بنایا کرتے تھے۔ اس خواب کے بعد ان دونوں دوستوں نے کبھی بھی قائداعظم کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔

تھوڑی خواتین ایسی تھیں جو قرآن کی کلاس سے آدھا گھنٹہ پہلے آتیں اور عربی گرامر بھی سیکھتی تھیں تھوڑا عرصہ میں بھی شامل رہی مگر جلد ہی احساس ہو گیا کہ یہ ایسا مضمون ہے دوسروں کو پڑھائیں گے تو یاد رہے گا ورنہ بھول جائے گا۔

آپا جی مجھ سے اکثر میڈیکل کیمپ کے بارہ میں پوچھتی رہتیں۔ جب کوٹ جہانگیر خان جانا بند ہو گیا تو مجھے کہنے لگیں کہ محترمہ ام راشد سے رابطہ کرو وہ بھی یہ کام اپنے طور پر کر رہی ہیں لاہور سے باہر درسِ قرآن کے لیے جاتی ہیں جو مریض لاعلاج پڑا ہوتا ہے اسے اپنی جیپ میں ڈال کر لاتیں اور لاہور کے ہسپتال میں علاج کرواتی ہیں۔

آپا بنت الاسلام کے مشورہ کے مطابق محترمہ ام راشد سے رابطہ ہوا اور ملاقات کا وقت اور جگہ مقرر ہوئی۔

کوٹ جہانگیر خان میں میڈیکل کیمپ

میڈیکل کے شعبہ میں کہاں کام کرنا چاہیے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کہیں فری ٹائم دینے پر دل راغب نہ ہوتا تھا۔ روزانہ رات کو سورہ فاتحہ کا وظیفہ پڑھتی اور اللہ تعالیٰ سے پوچھتی ''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' ایک رات خواب دیکھا سورہ محمد اور سورہ فتح پڑھ رہی ہوں۔ عصر کی نماز کے بعد یہ دونوں سورتیں پڑھنی شروع کر دیں۔

چند ہی دنوں میں ایک جگہ آپا نعیمہ جہانگیر خان اور محترمہ خورشید نیازی صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ میری مصروفیات کا پوچھتی رہیں۔ میں نے باہر دیہات میں بھی کچھ علاج کے طریقہ کا بتایا تو آپا نعیمہ نے بڑے شفیق لہجہ میں کہا۔

''ہمارے گاؤں سے کام شروع کرتے ہیں''۔

یکدم بات میرے دل کو پسند آئی۔محترمہ خورشید نیازی بھی انسانی ہمدردی رکھتی تھیں۔دونوں نے گرل گائیڈ میں بھی نوجوان لڑکیوں کو ادب آداب سکھانے اور کردار سازی میں بہت سال لگائے تھے۔

بیگم نعیمہ جہانگیر خان کے گاؤں کوٹ جہانگیر خان میں کام کا نظام سیٹ ہو گیا۔وہاں حویلی میں ہر پندرہ دن بعد میڈیکل کیمپ لگتا تھا دوائیاں ساتھ لے کر جاتے تھے۔آپا نعیمہ جہانگیر خان زیادہ تر ہلکی پھلکی دین کی تعلیم بھی دیتی تھیں۔کبھی ڈاکٹر زینب بھی جاتیں اور مسز ریحانہ رفیق بھی بہترین مددگار ثابت ہوتیں۔

ہم زیادہ تر صحن میں ہی مریضوں کو دیکھتے تھے۔کیونکہ حویلی بہت پرانی تھی اور کمرے زیادہ وقت بند رہتے تھے،تازہ ہوا کا فقدان تھا۔ایک مرتبہ ڈاکٹر نبیہہ حسن بھی ہمارے ساتھ تشریف لے گئیں تو اس جگہ کو دیکھ کر مشورہ دیا ''حویلی گرا کر یہاں نیا ہیلتھ سینٹر بننا چاہیے ورنہ یہ جگہ صحت کے حوالہ سے مضر ثابت ہوگی''۔بیگم نعیمہ جہانگیر صاحبہ کی حویلی اور زمین تھی۔

بہاری کالونی میں میڈیکل کیمپ

1970ء کی دہائی کے شروع میں ہی بہت سے بہاری لوگ پاکستان آئے تو ان کے لیے تقریباً تین سو کے قریب پانچ مرلہ کوارٹر حکومت نے بنائے تھے۔ایک گھر میں تقریباً12/13 افراد رہتے تھے ان کے لیے کوئی علاج کی سہولت نہ تھی۔

یہ آبادی لاہور میں ٹاؤن شپ اور گرین ٹاؤن کے درمیان واقعہ ہے سوچ بچار کے بعد یہی فیصلہ ہوا کہ اس آبادی میں بوڑھے اور بچے بھی بہت ہیں۔یہاں سے شروع کرنا چاہیے۔ام راشد نے گاڑی مہیا کرنے کی ذمہ داری لی اور دوائیاں ہم اپنے ذاتی صدقات اور زکوٰۃ سے خریدتے۔مددگار خواتین بیگم عامر اور آپا ساجدہ تھے۔یہ دونوں نہایت مخلص خواتین جذبہ خدمت خلق سے سرشار تھیں۔بھارت سے ہجرت کر کے لاہور سیٹ ہوئیں۔دونوں پڑھی لکھی اور دین سے محبت رکھنے والی تھیں۔اس کے بعد ایک روز آپا ام راشد ایک نئی نسبتاً جوان خاتون کو لے کر آئیں چونکہ رجسٹر پر اندراج بھی کرنا ہوتا تھا۔یہ گل رعنا تھیں جنہوں نے بہت شوق سے ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔

بہاری کالونی میں بہت غربت تھی دل چاہتا تھا کہ ان کی کسی طرح مالی امداد کی جائے مگر ہمارے وسائل محدود تھے۔ایک روز ہم لوگ اس جگہ مریض دیکھ رہے تھے کہ آپا ام راشد کے ساتھ ایک اور سہیلی بیگم فرحت روشن آئیں جو اپنی زکوٰۃ دینا چاہتی تھیں۔انہیں بتایا کہ یہاں اس چیز کی بیحد ضرورت ہے۔انہوں نے کچھ کمزور بچوں اور بوڑھوں کو دودھ کے لیے وظائف شروع کر دیے۔اسی طرح کچھ اور لوگوں کو اس پروجیکٹ کا پتہ چلا تو انہوں نے بھی اللہ واسطے کی رقوم ادھر دینا شروع کر دیں۔حالات کچھ بہتر صورت اختیار کر گئے۔تقریباً دو سال بہاری کالونی ہفتہ وار جاتے رہے۔

شاہدرہ میں سیلاب

ستمبر 1988ء میں شاہدرہ اچانک راتوں رات شدید سیلاب کی زد میں آ گیا۔جس سے بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان ہوا۔شہر لاہور کی تمام فلاحی تنظیموں نے دل کھول کر مدد کی۔کشتیوں میں کھانے پینے کا سامان اور ضروری ادویات پہنچائی گئیں۔اسی طرح ہمارے گروپ نے بھی کشتیوں میں امداد پہنچائی۔

چاولوں کی فصل تقریباً ڈیڑھ فٹ تک بڑی ہو چکی تھی زیادہ تر تو ڈوب گئے۔جب پانی کچھ کم ہوا سڑک نظر آنے لگی تو گاڑی سڑک پر کھڑی کر کے قریب کے گاؤں میں آپا ام راشد کے ساتھ بیگم عامر اور آپا ساجدہ جنہوں نے بے شمار سامان اٹھائے ہوئے تھے۔قریب کے گھروں میں پہنچے۔خواتین اپنے اپنے حالات و واقعات بتانے لگیں۔اس میں سانپوں کا بھی بہت ذکر تھا۔شام قریب آ رہی تھی یہ تینوں خواتین جلدی سے پگڈنڈی سے واپس آ رہی تھیں ایسا محسوس ہونے لگا ان کے پاؤں کے پاس سانپ گزر رہے ہیں خوفزدہ سی ہو گئیں۔آپا ام راشد نے صدقہ کی نیت کرنے کو کہا۔دونوں خواتین آپا ساجدہ اور بیگم عامر بتاتی ہیں کہ صدقہ ماننے کی نیت سے فوراً ہی ڈر جاتا رہا۔

کبھی کبھی مجھے حیرانی ہوتی ہے کس طرح ربِ کریم نے مجھے گھیر کر اس شعبہ خدمت خلق میں ڈالا اور اب اس کام میں بہت لطف محسوس ہوتا

بلکہ سکینت حاصل ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے جب بہاری کالونی سے تھک کر گھر پہنچتی، نماز اور کھانے کے بعد گھنٹہ بھر کی اتنی اچھی نیند آتی کہ شام کی نماز کے لیے بالکل تازہ دم ہو جاتی۔ یہ رحمٰن رحیم ذات کی توفیق ہے جو کہ مانگنے پر ہی عطا کرتا ہے۔

فاطمہ جناح میڈیکل کالج کی پرنسپل ڈاکٹر بشارت صاحبہ نے بھی مجھے کالج میں پہلے سال کی طالبات کے لیے Demonstrator کی نوکری دی تھی مگر پھر وہی مسئلہ ہؤا چکر آتے یا پھر کسی کام کے لیے بینک یا بچوں کے سکول جانا پڑتا تو پورا وقت ڈیوٹی نہیں ہو سکتی تھی پھر یہ حلال رزق تو نہ ہوتا۔ ان دنوں میں نے ہفتے کے چار دن دو گھنٹے ایک خواتین کے فلاحی ادارے میں بھی اجرت پر کام کیا۔ اسی جگہ ڈاکٹر خورشید ملک (مرحومہ) شام کو دو گھنٹے اللہ کی راہ میں وقت دیتی تھیں اور یہ سن کر حیرت ہوتی کہ وہ کیسے بغیر معاوضہ کے وقت دے سکتی ہیں۔ صبح کے وقت وہ پی۔ سی ایس آئی آر میں میڈیکل آفیسر کی جاب کرتی تھیں۔ اب خیال آتا ہے پروردگار ہنستا ہوگا کہ نوکریوں کے مزے چکھ لے تیری بھی ادھر کے لیے راہنمائی کروں گا۔

کام کا پھیلاؤ

سیلاب کے بعد جب حالات کچھ بہتر ہوئے تو شاہدرہ کی خواتین کا اصرار شروع ہو گیا کہ ہر ہفتہ ان کے مریضوں کو ٹائم دیا جائے۔ ویسے بہاری کالونی کے لیے گورنمنٹ کا ہسپتال ٹاؤن شپ میں بن رہا تھا اور گرین ٹاؤن میں ایک چھوٹی ڈسپنسری کھلی تھی کچھ لوگوں نے تھوڑی فیس پر پرائیویٹ کلینک بھی شروع کر لیے تھے۔

شاہدرہ کے علاقہ میں بہت سال پہلے جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والی ایک نیک دل خاتون آپا جان زبیدہ بلوچ نے وہاں کی بستی جیا موسیٰ میں درسِ قرآن شروع کیا تھا ان کے ساتھ منصورہ (لاہور) سے ایک ڈاکٹر بھی آتیں جو کہ علیل خواتین کا علاج وغیرہ کرتی تھیں۔ یہ سلسلہ کافی سال چلتا رہا پھر آپا جان کی گھر میں ہی گرنے کی وجہ سے ٹانگ کی بڑی ہڈی ٹوٹ گئی تو یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ اس پروگرام کا یہ فائدہ ضرور ہؤا بہت سے خاندانوں میں دینی شعور بیدار ہو چکا تھا۔

شاہدرہ کا رقبہ تقریباً بائیس کلومیٹر ہے اور یہ مختلف آبادیوں/ بستیوں میں بٹا ہؤا ہے وہاں کے لوگوں سے صلاح مشورہ کے بعد یہی طے ہؤا کہ ہر ہفتہ ایک آبادی میں کیمپ لگائیں گے۔ برکت ٹاؤن سے شروع کیا جو کہ شاہدرہ سٹیشن سے تقریباً تین میل شمال کی جانب ہے۔ دوسرا فیروز والا تھا۔ تیسرا بیگم کوٹ جو کہ شیخوپورہ روڈ پر واقع ہے اور چوتھا کوٹ شمس آباد راوی دریا کے دوسری طرف تقریباً دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

برکت ٹاؤن اور بیگم کوٹ میں جذبہ والے محبِّ وطن خاندانوں نے اپنے گھر کا صحن اور برآمدہ اس کام کے لیے دے رکھا تھا۔ مریضوں کے بیٹھنے کے لیے چارپائیاں اور کچھ بینچ اور عملہ کے لیے کرسیاں اور دو عدد میزوں کا بندوبست کرتے فیروز والا جس گھر نے شوق سے ہمیں مدعو کیا اسی گلی میں حکومت کی ڈسپنسری بھی تھی۔ جس ہفتہ کے روز ہم وہاں گئے اس دن روٹین کی ٹیم کے ساتھ پروفیسر ڈاکٹر کشور معین بھی تھیں ان کی موجودگی ہمارے لیے بڑی خوشی کا باعث ہوئی۔ کام ختم کرنے کے بعد جب ہم نے گرد و نواح کا جائزہ لیا تو سب کا متفقہ فیصلہ تھا یہاں کیمپ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔

نومبر 1988ء کا تیسرا ہفتہ تھا اس روز کوٹ شمس آباد کی باری تھی۔ یہ آبادی راوی کے پار تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے بڑی سڑک سے کافی نیچے تھی گھر زیادہ تر کچے پکے قسم کے تھے (اب تو وہاں کے حالات بہت بہتر ہو چکے ہیں۔ گلیاں اور گھر سب پکے بن چکے ہیں) اس پورے پروجیکٹ کی انچارج ایک آپا صفیہ اور ان کی معاون خواتین ہوتی تھیں۔ انہیں سے ہم لاہور میں رابطہ رکھتے تھے۔ اس روز کے لیے پروگرام یہ طے ہؤا تھا کہ چونکہ گھر ابھی پوری طرح خشک نہیں ہوئے اس لیے گورنمنٹ کے پرائمری سکول کی عمارت میں مریض دیکھیں گے۔

تقریباً صبح کے پونے گیارہ ہم چار لوگ سبز رنگ کی جیپ میں سکول کے سامنے پہنچے تو دیکھا آپا صفیہ صاحبہ اپنے کالے برقع میں ملبوس

وہاں پریشان کھڑی ہیں۔ ساتھ میں چند ایک گاؤں کی خواتین بھی تھیں استفسار پر معلوم ہؤا کہ سکول کی چابی نہیں مل سکی اور چوکیدار لاپتہ ہے۔ وہ لوگ کہتی ہیں کسی کے گھر میں کیمپ لگاتے ہیں پاس ہی ایک گھر کی طرف مجھے لے گئیں بالکل نامناسب جگہ تھی۔ صحن کچا اور گیلا تھا۔ پھر گاؤں کے دوسری طرف ایک گھر مجھے دیکھنے کو کہا جس کا دالان کچا اور گیلا تھا اندر ایک اندھیرا سا خالی کمرہ تھا۔ غالباً اس گھر کے مکین ابھی سیلاب کے بعد واپس ہی نہ لوٹے تھے اس روز سردی بے اندازہ تھی دھوپ بالکل مدھم سی تھی۔ باہر دو عدد بوسیدہ سی چارپائیاں پڑی تھیں ان کی طرف اشارہ کیا اور محترمہ کہتی ہیں ''اب یہاں مریضوں کو دیکھ ہی لیں یہاں بہت سی بیماریاں ہیں''۔

حیران اور زیادہ پریشان ان کی شکل دیکھی۔ ''کہاں دوائیاں اتاریں خود کدھر بیٹھیں اور مریض کا معائنہ کیسے کریں؟'' مگر ان کا اصرار ''یہاں تو بہت لوگ بیمار ہیں''۔ یہ سن کر وہیں چارپائی پر بیٹھ گئی اور دل ہی دل میں اپنے خالص و مالک سے رابطہ کیا۔ ''پروردگار تُو تو جانتا ہے ہم کس غرض سے آئے ہیں اتنی بے بسی ہے کیسے تیری مخلوق کی خدمت کریں''؟ ساتھ ہی ٹپ ٹپ آنسو گرنے شروع ہو گئے۔ تھکن اور سردی سے بھی بُرا حال ہو رہا تھا۔

پھر وہ بولیں ''اب کیا فیصلہ کرنا ہے''؟ ہم واپس جا رہے ہیں اور انشاءاللہ تعالیٰ اب اپنی عمارت کا بندوبست کریں گے''۔

وہ تو وہیں رُک گئیں کیونکہ تفتیش کرنی تھی کہ چابی کا بندوبست کیوں نہ ہؤا۔ جس کی ڈیوٹی لگائی تھی اس کی پرسش کرنی ضروری تھی۔ میری تین عدد ساتھی اس وقت سے جیپ ہی میں تشریف فرما تھیں۔ بیگم عامر اور آپا ساجدہ رحمٰن پورہ سے ساتھ آتے تھے اور باجی عنایت مرحومہ اسلامیہ پارک میں ہی رہتی تھیں۔

گھر پہنچ کر پہلا کام محترمہ ام راشد کو فون کیا جو گاڑی بھیجا کرتی تھیں انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا۔

انہیں دنوں میں ایک نیا پروگرام 'دلوخورد' میں شروع کرنے کے بارہ میں سوچ بچار ہو رہی تھی یہ جگہ قصور کے راستہ میں لاہور جنرل ہسپتال سے 9/10 میل آگے ہے۔ زرخیز زمین بنجر ہو چکی تھی۔ کافی زمین کرسچن لوگوں نے خرید کر وہاں یوحنا آباد بنا لیا تھا یہاں غریب لوگوں کا مفت علاج اور مفت تعلیم کا بھی بندوبست ہے۔ اس گاؤں میں مڈل سکول کی ہیڈ ٹیچر محترمہ شمیم صاحبہ نے آپا ام راشد سے رابطہ کیا اور بہت اصرار کے بعد انہیں راضی کر لیا۔ ''دس مرلہ ذاتی زمین ہبہ کرنا چاہتی ہوں تا کہ آپ یہاں درسگاہ بنائیں اور اس آبادی کے لوگ دین کی طرف راغب ہوں''۔

ہماری قریبی سہیلیاں جو کہ گاؤں کی فلاح و اصلاح کے پروگراموں میں دلچسپی لیتی ہیں حالات سے آگاہی رکھنا چاہتی تھیں اس لیے ہر ماہ کے شروع میں صبح کے وقت کسی ایک کے گھر میٹنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بلکہ سب سے پہلے محترمہ ام نجیب نے کہا ان کے گھر پہلی میٹنگ ہو گی وہ خود بھی اور ان کی قریبی رشتہ دار زکوٰۃ و صدقات دیتی رہتی تھیں۔ سب کو آگاہ بھی کر دیا جاتا کہ پچھلے ماہ کی رقم کن کاموں میں خرچ ہوئی۔

جب کوٹ شمس آباد سے کام کیے بغیر واپس آئے تھے تو یہی سوچا تھا میٹنگ میں یہ ضروری بات سب کے سامنے پیش کی جائے۔

جنوری 1989ء کی میٹنگ میں اپنی جگہ کی اہمیت کے بارے میں بات کی تو سب کا ردعمل بہت حوصلہ افزا تھا اکثریت نے کہا جگہ دیکھنی شروع کریں رقم کا بندوبست ہو جائے گا۔

ہماری امیرہ محترمہ ام راشد کا تجربہ ان کاموں میں ہم سب سے زیادہ ہے۔ انہوں نے اسی روز مشورہ دیا۔ ''آج ہر کوئی اپنی توفیق کے مطابق اس کام کے لیے صدقہ نکالے اللہ تعالیٰ بہت جلد بندوبست کر دیں گے''۔ تمام حاضرین نے ایک ہزار سے پانچ ہزار تک رقوم نکالیں۔ میں نے جمع کیں اور الگ لفافہ میں سنبھال لیں۔ اسی شام مجھے ایک ساتھی ام فہیم کا فون آیا کہ وہ پچاس ہزار دیں گی مگر کسی کو بتانا نہیں چاہتیں۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

محشر خیال

پروفیسر خواجہ مسعود۔ راولپنڈی

ستمبر 2020 کا ہلکے رنگوں سے مزین ٹائٹل بہت بھلا لگا۔

''بتدا تیرے نام سے'' اپنے اداریہ میں مدیرہ محترمہ صائمہ اسما نے دوران ماہ پیش آنے والے تمام حالات واقعات کا اچھا ناقدانہ جائزہ لیا ہے خاص طور پر کراچی کی تباہ حالی پر اچھا تبصرہ ہے اور ارباب اقتدار کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی ہے۔ ٹیکسٹ بکس کے بارے میں بھی آپ نے صحیح خبر دار کیا ہے۔ ہمیں آنکھیں بند کر کے آکسفورڈ پریس کی کتابیں اپنے سکولوں میں نہیں لگوانی چاہیں ان کی کئی باتیں ہمارے کلچر اور مذہبی معاشرتی روایات کے خلاف ہوتی ہیں۔

''قرآن ایک معجزاتی کتاب'' (اسوہ بتول۔ القصیم) آپ نے شروع میں ہی یہ خوبصورت جملے لکھے ہیں ''قرآن ایسی کتاب ہے جس کی گہرائی اور خوبصورتی کی کوئی مثال نہیں۔ اس کی وسعت کے آگے آسمان کی وسعت بھی ہیچ ہے''۔

اور پھر یہ پیارے جملے ''قبر میں یہ قرآن روشنی اور راحت بن کر آئے گا روز محشر یہی قرآن ہمارے لیے گھنے بادلوں کا سایہ بن کر آئے گا۔ جب چہار سو کڑی دھوپ ہوگی اور قیامت کے دن قرآن ہی ہمارے لیے ذریعہ نجات ہوگا۔ حق یہ ہے کہ قرآن پاک کو ترجمے کے ساتھ پڑھیں۔ اس کی تلاوت میں غور و فکر کریں۔ قرآن پورے کا پورا نصیحت سے بھرا پڑا ہے''۔

''حیا سراسر خیر ہے'' (ڈاکٹر میمونہ حمزہ) آپ نے بجا لکھا ہے کہ حیا مومن مردوں اور مومن عورتوں کی زینت ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی بہت حیا دار ہے انسانوں کے گناہوں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ ہمارے رسول پاکؐ میں بھی حیا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جس معاشرے میں حیا نہ رہے وہ اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اور اس میں فواحش پھیل جاتے ہیں۔

سیدہ فاطمۃ الزہراؓ (افشاں نوید) مدلل سونے کے ساتھ حضرت فاطمہؓ الزہرا کی شخصیت پر ایک بہترین مضمون ہے۔ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے فرمایا ''فاطمہ جنت کا خوشبودار پھول تھی جس کے مرجھانے کے باوجود اس کی خوشبو سے بھی تک میرا دماغ معطر رہتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا''۔

''کشمیر کی فریاد'' عنایت علی خاں صاحب کی کشمیر کی حالت زار پہ ایک بہترین نظم ہے۔ دو منتخب اشعار پیش ہیں۔

ہر طرف جبر کے آثار نظر آتے ہیں
کل جہاں گُل تھے وہاں خار نظر آتے ہیں
شعلہ زن کوچہ و بازار نظر آتے ہیں
نوجواں لاشوں کے انبار نظر آتے ہیں

''خوشیوں کی گھڑی'' فائقہ اویس صاحبہ کی خوبصورت نظم نے ایک منتخب شعر:

ہر رنگ قزوں ، فصل بہاراں بھی ہری ہے
خوشبو بھی قبا اوڑھ کے پھولوں کی کھڑی ہے

آمنہ رمیصا زاہدی نے چھوٹے بحر میں خوبصورت غزل لکھی ہے

یہ دور حاضر کے پر فتن کے راستوں میں ہر دم
پڑھا رہا ہے قدم قدم پر وقار میرا
میری ترقی کے جگمگاتے ہوئے گگن پر
حجاب رہتا ہے ہالہ بن کر حصار میرا

''مداوا'' (حمیرا بنت فرید) ہمارے معاشرے میں موجود جہالت زدہ رویوں کی عکاس ایسی کہانیاں پڑھ کے دکھ ہوتا ہے۔

''تلاش'' (بنتِ شیروانی) ایک اچھی کہانی۔جس میں بتایا گیا ہے کہ آج کل ہم موبائل، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے کتنے محتاج ہوکر رہ گئے ہیں۔زندگی کا حسن ہی ختم ہو کے رہ گیا ہے۔اس دفعہ اچھی کہانیوں کی کمی محسوس ہوئی ہے۔

''سیل اشک'' (بنت الاسلام) ایک عظیم نیک اور پاسا شخصیت آپا حمیدہ بیگم صاحبہ کی یاد میں لکھا گیا ایک خوبصورت مضمون ہے۔یہ جملہ ان کی شخصیت اور کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔'' آپا حمیدہ بیگم کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ لوگوں کی نوجوان بچیوں کو ہدایت کی راہ دکھاتی ہیں۔آپا ہمیشہ بے چین رہتی تھیں کہ لوگ دین کی راہ پر آجائیں''۔

''جہاں زندگی کا راز پالیا'' (ملائشیا) ڈاکٹر مریم فاروقی صاحبہ کا ملائشیا کے بارے میں اچھا معلوماتی مضمون ہے۔خاص طور پر یہ چیز متاثر کرتی ہے کہ وہاں کی خواتین باعمل مسلمان ہیں اور ملائشین فرض شناس لوگ ہیں۔

''ذرا فاصلے سے ملا کرو'' (ڈاکٹر میمونہ حمزہ) آپ نے شگفتہ پیرائے میں خوب واضح کیا ہے کہ کرونا نے ساری دنیا کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ ملنا جلنا ترک ہوگیا، ہاتھ نہیں ملا سکتے، گلے نہیں مل سکتے نماز مسجد میں جا کر نہیں پڑھ سکتے۔اللہ تعالیٰ جلد ساری دنیا کو اس وبا سے نجات دے (آمین)

''سعودی عرب میں رہنے کا تجربہ'' (فائقہ اویس) سعودی عرب اور سعودیوں کے بارے میں خاصا معلوماتی مضمون ہے۔عربیوں کی گفتگو کرنے کا انداز، ان کی زبان، لہجے، ان کی معاشرت وغیرہ پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

''باغبانی سے میں نے کیا سیکھا'' (فریدہ خالد) گھریلو باغبانی پر ایک اچھا معلوماتی مضمون ہے۔گھر پر سبزیاں اور پھل کاشت کرنے کے بے شمار فوائد گنوائے گئے ہیں۔یہ جملہ خاص طور پر اچھا لگا 'در اصل پودے، پھول، مٹی اور پانی آپ کو فطرت کے قریب کرتے ہیں اور ان کی قربت آپ پر قدرت کے بہت سے راز افشا کرتی ہے''۔

''حجاب میری نظر میں'' مختلف نامور خواتین کے حجاب کے بارے میں اچھے خیالات تحریر کیے گئے ہیں۔اس سے خواتین کے لیے حجاب کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔خاتون کا حجاب اسے معاشرے کے شر سے بچا کر رکھنے کا ذریعہ ہے۔

جیسے گوہر میں ہے صدف محفوظ
ہم بھی محفوظ ہیں حجابوں میں

''بلریا گنج سے جنت البقیع تک'' عرفان صدیقی صاحب کا کالم اچھا انتخاب ہے۔

گوشہ تسنیم ''شریک زندگی کا انتخاب'' (ڈاکٹر بشریٰ تسنیم صاحبہ) اس بار آپ نے شریک زندگی کے انتخاب کے بارے میں نہایت مناسب مشورے دیے ہیں یہ جملہ بڑا قیمتی ہے ''خلوص نیت کے ساتھ عظیم مقاصد کو سامنے رکھ کر تعلیمات نبویؐ کے مطابق شریک حیات کی تلاش ہوگی تو زندگی میں بے شمار معاشی اور معاشرتی مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا''۔اور یہ جملہ بھی قابل غور ہے ''عموماً لڑکے سے زیادہ بہنوں اور والدہ کے ارمان لڑکی کے انتخاب میں پیچیدہ سوچ رکھتی ہیں صالح لڑکے کو چاہیے کہ اپنی والدہ اور بہنوں کو اس معاملے میں شائستگی کی راہ دکھائے''۔

ادارہ بتول اور قارئین کے لیے نیک خواہشات

☆.....☆.....☆

گوشۂ تسنیم

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

شریکِ زندگی کا انتخاب

(گزشتہ سے پیوستہ)

شریک زندگی کا انتخاب پوری یکسوئی، اطمینان قلب اور نیک نیتی سے کرنے کے لیے "توکل علی اللہ" ہونا کامیابی کی ضمانت ہے۔ جب طریقہ انتخاب مسنون ہوگا اور ترتیب انتخاب مسنون رہے گی تو پھر:

''کیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں؟''

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کے لیے کافی ہوگا جو اپنے اسباب و وسائل کی فراوانی کے باوجود اللہ تعالیٰ پہ توکل کریں گے۔ یا قلیل دنیا ملنے پہ بھی بھروسہ رب العلمین پہ ہی کریں گے۔

شریکِ زندگی ایک دوسرے کے لیے کیسے ساتھی ثابت ہوں گے اس کا اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے جب تک زندگی کے میدان میں اترا نہیں جاتا اپنے اخلاق و کردار کی ضمانت دینا مشکل ہے۔ کیونکہ جب انسان زندگی کے مسائل سے تنہا نبرد آزما ہوتا ہے تو اپنی صوابدید پہ فیصلے کرتا ہے، لیکن جب اس زندگی کے ہر لمحہ میں دوسرا فرد شریک ہوتا ہے تو افکار واعمال مشترک ہوجاتے ہیں۔ زاویہ نظر دو، ذہن بھی دو ہوتے ہیں اور مزاج بھی مختلف ہوتے ہیں، جذباتی کیفیات بھی ہر معاملے میں ایک جیسی نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے کہ ہر دو صنف کی جسمانی اور ذہنی ساخت کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ پھر موروثی اثرات، تعلیم و تربیت، معاشی و معاشرتی و تہذیبی ماحول کی وجہ سے ذہنی مطابقت میں بعد ہوسکتا ہے۔ ''کفو'' کے تقاضے پورے ہونے کے باوجود میاں بیوی ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے دو الگ سیاروں کی مخلوق ہوں۔ اس لیے متضاد ذہنی احساسات کے ٹکراؤ کے وقت ہی اخلاقی سطح کا فیصلہ ہوسکتا ہے۔

عشق و محبت کے دعویدار ہوں، یا ذہنی مطابقت کا یکساں معیار تلاش کر لینے والے، ان کے دعوے اور معیار کی آزمائش نکاح کے بعد ہی ہوتی ہے. چونکہ زندگی میں نشیب و فراز آنا لازم ہیں اور اسی لوازم کے ساتھ ساتھ شوہر اور بیوی کی تربیت بھی ہوتی رہتی ہے اور دونوں کا ایک دوسرے کی قابلیت وصلاحیت کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے اور تحمل و برداشت کا امتحان ہوتا رہتا ہے۔ شادی کے بعد میاں بیوی ایک دوسرے کی تربیت کرتے یا ایک دوسرے کو خوشی سے یا مجبوراً برداشت کرتے اکٹھے ساتھ پروان چڑھتے ہیں۔ اب یا تو قریب ہوتے جاتے ہیں یا وقت کے ساتھ ساتھ دوریاں بڑھتی جاتی ہیں۔

عموماً مثال دی جاتی ہے کہ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیّے ہوتے ہیں۔ واقعتاً کوئی بھی گاڑی ایک پہیّے پہ نہیں چل سکتی۔ مگر حقیقت یہ بھی ہے کہ کسی بھی گاڑی کو استعمال کرنے کے لیے دو پہیّے مناسب جگہ پہ لگانے کی شرط ہے۔ اگر سائیکل ہے تو دو پہیّے آگے پیچھے ہیں، اگر گاڑی ہے تو دو پہیّے مناسب فاصلے پہ ہیں مگر دونوں کو ایک ہی وقت میں ایک ساتھ چلنا ہے۔ یعنی زندگی کی ایک ہی سڑک پہ دونوں نے اپنے اپنے مقام پہ رہ کے ایک ساتھ ہی چلنا ہے۔ ہم رکابی اور شانہ بشانہ ساتھ چلنے کے لیے ازدواجی زندگی میں بھی یہی مثال صادق آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کسی رشتے کو اپنی نشانی قرار نہیں دیا سوائے میاں بیوی کے، دو اجنبی مخالف صنف کے افراد کو چار گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کے ساتھ ہی ایک ایسے رشتے میں باندھ دیا جاتا ہے جس سے ہر شے مشترکہ ہوگئے۔ جسم و جان بھی مال و دولت بھی اور عزت و آبرو بھی۔ سبحان اللہ کہ وہ نکاح کے دو بول جس سے بڑھ کر کوئی اور بول محبت کے لیے اکسیر نہ پائے گئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دو محبت کرنے والوں میں نکاح کے دو بول سے بڑھ کر کوئی چیز اکسیر نہیں'' (مشکوٰۃ 266)۔

قرآن پاک میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا

(البقرہ187)۔

میاں بیوی کے رشتے کو واضح کرنے کے لیے اس سے زیادہ جامع مثال ممکن ہی نہ تھی۔لباس کی جوخوبیاں اور جوفوائداورتقاضے ہوتے ہیں وہ سب میاں بیوی کے رشتے سے منسلک ہیں۔ایک دوسرے کی زینت ہے، پردہ پوشی ہے، اس زندگی کے سردوگرم سے حفاظت کا ذریعہ بھی ہیں۔

نکاح کے بعد مرداورعورت میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس بن جاتے ہیں۔گویا کہ وہ ایک سادہ ان سلا کپڑا تھا اب دونوں نے خود کوایک دوسرے کے مزاج، پسند ناپسند، عادات کے مطابق ڈھالنا ہے۔جیسے سادہ کپڑے کوانسان کے قد کاٹھ جسم کی مناسبت سے ہی قطع و برید کر کے سیا جاتا ہے۔بے ڈھنگا لباس جوجسم سے مناسبت نہ رکھتا ہوشخصیت میں کشش نہیں رہنے دیتا۔ اسی طرح میاں بیوی کو ایک دوسرے کے جذبات، خواہشات، عادات و اطوار کے مطابق قطع و برید کرنا پڑے گی۔ایک دوسرے کی فطری انسانی کمزوریوں کے خلا کو اپنی خداداد صلاحیتوں سے پر کرنا ہوگا۔اورایک دوسرے کے عیب کی اصلاح کرنی ہوگی پردہ پوشی کے ساتھ اور جو درجہ بندی اللہ تعالیٰ نے شوہراور بیوی میں رکھی ہے اس کی حقیقت کو جان لینا چاہیے۔اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام احسن طریقے سے جاری رکھنے کے لیے کائنات کی ہر شے کا مقام متعین کر دیا ہے۔

واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروالمیزان (الرحمٰن)

ہر شے اپنے مقام پہ اہم ہے اوراسی طرح ہی کارآمد ہے جیسے اور جہاں اسے رکھا گیا ہے۔نظام فلکی ہو یا ارضی، کوئی بھی دیوہیکل مخلوق ہو یا مچھر جیسی معمولی، الخالق کی نظر میں اہم ہے اوراس کی کائنات کا اہم پرزہ ہے۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کسی بھی انسانی تخلیق میں ایک معمولی کیل یا پرزے نہ ہونے سے یا غلط جگہ لگنے سے مشین کارآمد نہیں ہوتی تو اللہ رب العالمین نے کارخانہ قدرت میں کوئی شے بیکار کیسے بنائی ہوگی۔

اللہ رب العزت نے مرد کوعورت پہ ایک درجہ زیادہ کا فیصلہ کر کے عورت کو کمتر نہیں کیا کہ اس کو دوسرے درجے کی عزت دی جائے، اس کی وجہ سے عورت انسان کے درجے سے نہیں گرائی گئی۔

دنیا کا نظام چلانے کے لیے جس کا جہاں مقام الخالق نے متعین کیا ہے اس کو بدلنے سے میزان میں خلل پیدا ہوتا ہے.

متعین ربانی نظام کو تسلیم نہ کرنے سے سب سے زیادہ خلل میاں بیوی کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔اور شیطان کا یہی پہلا اور آخری ٹارگٹ ہے۔شیطان کو ناکام کرنے کے لیے ہوش وخرد سے کام لینا ضروری ہے کوئی تربیت، کسی کتاب کا سبق میاں بیوی کو کامیاب میاں بیوی نہیں بنا سکتا جب تک وہ دونوں ایک دوسرے کا لباس نہیں بن جاتے، بدن اور لباس ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں اور کپڑے کو لباس بننے کے لیے اپنے اصل کا وجود بدلنا پڑتا ہے۔میاں بیوی دونوں کو لباس کہا گیا ایک دوسرے کا تو دونوں کو درست ناپ کا لباس بننا ہوگا اور موسم وحالات کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔

درزی کے ہاتھوں میں آئی قینچی کپڑے کو قطع و برید کر کے درزی کو ہنرمند ثابت کرتی ہے۔اپنی شخصیت میں موجود غرورنفس کو نفس امارہ کی قینچی سے قطع و برید کرنا ہوگا۔انسان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ جسم کے مطابق لباس تیار کرلے مگر یہ ممکن نہیں کہ پہلے لباس سی لے اور پھر اس کے مطابق اپنا قد کاٹھ اور جسم کی تراش خراش کرنے کی کوشش کرے۔ جب میاں بیوی کا رشتہ بن جاتا ہے تو پھر ہی لباس کہا گیا ہے۔

جب انسان اپنے جسم سے سمجھوتہ کر لیتا ہے تو لباس اس کے مطابق ہی سیتا ہے تاکہ بھلا بھی لگے اور آسانی بھی محسوس کرے۔شریک زندگی کا لباس بننے کے لیے بھی دونوں کو ایک دوسرے کے ظاہری و باطنی وجود سے سمجھوتہ کرنا کامیابی کی شرط ہے.....ساری کائنات ایک دوسرے کے ساتھ سمجھوتے کے اصول پہ قائم ہے۔اس بنیادی رشتے میں نیک نیتی سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی غرض سے باہم سمجھوتہ دنیا و آخرت میں سرخروئی کی ضمانت ہے۔

☆.....☆.....☆

انصار عباسی

سچ تو یہ ہے

تاریخ کو اپنی مرضی سے مسخ کرنے کا رواج عام ہے اور اس سلسلے میں ایسے منافقوں، سازشیوں اور شرارتیوں کی بھی کمی نہیں جو قائداعظم اور تاریخ پاکستان سے متعلق حقائق کو مسخ کرتے ہیں۔ ایسے افراد بھی بہت ہیں جن کی اپنی نیت خراب نہیں لیکن وہ مسخ شدہ تاریخ پڑھ کر اس پر یقین کر بیٹھتے ہیں اور پھر یوں ایک ایسا سلسلہ چل نکلتا ہے کہ جھوٹ سچ کو چھپا دیتا ہے۔ ایسے افراد اب بہت کم ہیں جو ریسرچ کر کے تاریخی حوالوں کا کھوج لگا کر سچ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ سچ کو سامنے لایا جائے اور تاریخ کو مسخ ہونے سے بچایا جائے۔ محترم ڈاکٹر صفدر محمود انہی چند شخصیات میں سے ایک ہیں اور ان کی سب سے بڑی دلچسپی قائداعظم، تاریخ پاکستان، علامہ اقبال اور ہر وہ فرد، جس کا پاکستان کے قیام میں کسی حد تک بھی کردار رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب انہی موضوعات پر کئی کتابیں لکھ چکے لیکن اب انہوں نے بڑی تحقیق کے بعد ایک نئی کتاب ''سچ تو یہ ہے؟'' تصنیف کی جس کا بنیادی مقصد نوجوان نسل، میڈیا اور پڑھے لکھے طبقہ کو اس سچ سے تاریخی حوالوں کے ساتھ آگاہ کرنا ہے جس کو ایک طبقہ جان بوجھ کر مسخ کرتا ہے تاکہ پاکستان اور اسلام کو جدا کیا جا سکے۔ 1948ء کو عید میلاد النبی کے موقع پر کراچی بار ایسوسی ایشن کے استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا:

''میں ان لوگوں کے عزائم نہیں سمجھ سکا جو جان بوجھ کر شرارت کر رہے ہیں اور یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ پاکستان کے آئین کی بنیاد شریعت پر نہیں ہوگی۔ ہماری زندگی پر آج بھی اسلامی اصولوں کا اسی طرح اطلاق ہوتا ہے جس طرح 1300 سال پہلے ہوتا تھا۔ اسلام نے ہمیں جمہوریت سکھائی اور مساوات اور انصاف کا سبق دیا اس لیے کسی کو بھی خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں''۔

ڈاکٹر صاحب قائداعظم کی تقاریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کے آئین کی بنیاد شریعت پر نہیں رکھی جائے گی وہ سازشی اور منافق ہیں اور آخر میں (قائد نے) یہ کہہ کر تمام شکوک و شبہات کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی کہ پاکستان کا آئین جمہوری ہوگا اور اس کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی جائے گی۔

قائداعظم کو سیکولر بنا کر پیش کرنے والوں کے جھوٹ کو بھی اس کتاب میں خوف فاش کیا گیا۔ نہ صرف یہ کہ قائد کی سینکڑوں تقریروں میں کسی ایک میں بھی سیکولرزم کے حق میں بات نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس اسلام ہی ان کی تقریروں کا محور رہا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے 1939 میں منعقد ہونے والے اجلاس میں قائد کی تقریر کے چند فقرے پڑھیے تاکہ آپ کو اس اصل جناح کا سراغ مل سکے جو بظاہر انگریزی بولتا، مغربی لباس پہنتا اور مغربی طور طریقوں پر عمل کرتا تھا۔ قائد کے الفاظ تھے۔

''مسلمانو! میں نے دنیا کو بہت دیکھا دولت، شہرت اور عیش و عشرت کے بہت لطف اٹھائے۔ اب میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد اور سربلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین اور اطمینان لے کر مروں کہ میرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہوں کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی۔ میں آپ کی داد اور شہادت کا طلب گار نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مرتے دم تک میرا اپنا دل، ایمان اور میرا ضمیر گواہی دے کہ جناح نے مدافعت اسلام کا حق ادا کر دیا۔ جناح تم مسلمانوں کی حمایت کا فرض بجا لائے۔ میرا خدا یہ کہے

کہ بیشک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبے میں اسلام کو سر بلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے''۔

نومبر 1945 میں قائداعظم نے پشاور میں کہا:

'' آپ نے سپاسنامے میں مجھ سے پوچھا ہے کہ پاکستان میں کون سا قانون ہوگا۔ مجھے آپ کے سوال پر سخت افسوس ہوا۔ مسلمانوں کا ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک کتاب ہے یہی مسلمانوں کا قانون ہے اور بس ۔ اسلام پاکستان کے قانون کی بنیاد ہوگا اور پاکستان میں کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں ہوگا''۔

ڈاکٹر صفدر محمود لکھتے ہیں کہ 11 اگست 1947 کی تقریر جسے دین بیزار اور سیکولر حضرات دن رات اچھالتے ہیں اور ان کی کسی دوسری تقریر کا ذکر ''حرام'' سمجھتے ہیں، اس میں بھی قائد نے پاکستانی قوم سے لسانی، نسلی، علاقائی اور صوبائی شناختوں کو دفن کر کے پاکستانی بننے کی تلقین کی تھی ۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ سیکولر دانشوروں کی ایک منظّم لابی کو قائداعظم کی اسلامی ریاست کے بیانیے سے چڑ ہے اور ان کا ایجنڈا پاکستان کو صرف ایک سیکولر جمہوری ملک بنا کر اسے ہر قسم کی اخلاقی و اسلامی قدروں سے بے نیاز اور اسلامی اصولوں کی گرفت سے آزاد کرنا ہے تا کہ یہاں مغربی کی مانند مادر پدر آزاد معاشرہ قائم کیا جا سکے اور ناؤ نوش سے لے کر جسم فروشی تک ہر قسم کی آزادی حاصل ہو۔ بظاہر یہ حضرات سیکولرزم کی آڑ میں اقلیتوں کے حقوق کی وکالت کرتے ہیں حالانکہ اسلامی ریاست اقلیتوں کو برابر کے شہری حقوق دیتی ہے اور مذہبی آزادی کی ضمانت مہیا کرتی ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے اس سیکولر لابی کے اس جھوٹ کو بھی بے نقاب کیا جس میں وہ دوسرے کئی تاریخی واقعات کو مسخ کرنے کے علاوہ کبھی جگن ناتھ آزاد سے پاکستان کا قومی ترانہ لکھواتے ہیں، کبھی قرارداد پاکستان کو چوہدری ظفر اللہ خان کا کارنامہ قرار دیتے ہیں، کبھی قائداعظم کی گیارہ اگست کی تقریر کا من پسند مفہوم نکالتے ہیں تو کبھی قرارداد مقاصد کو تمام خرابیوں کی جڑ قرار دیتے ہیں ۔ میری ذاتی رائے میں حکومت اور دوسرے ریاستی ذمہ داروں کو چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کو تعلیمی اداروں، سول سروس و فوجی اکیڈمیوں اور ملک بھر کی لائبریریوں میں سرکاری طور پر فراہم کرے، میڈیا ہاؤسز اور اینکر پرسنز کو بھی اس کتاب سے استفادہ کرنا چاہیے تا کہ پاکستان کی اسلامی اساس، دو قومی نظریہ قائد اعظم اور دوسرے اہم تاریخی واقعات کے بارے میں منافقوں، شرارتیوں اور سازشیوں کے ایجنڈے سے اپنی نئی نسل کو گمراہ ہونے سے بچایا جا سکے۔

☆.....☆.....☆